

جاسوسی دنیا نمبر 28

بے گناہ محرم

(مکمل ناول)

دو چنچیں

پرویز اس وقت چونکا جب شیشے کی دوات اس کی مٹھی میں چکنا چور ہو گئی۔ شیشے کے ٹکڑے اس نے فرش پر ڈال دیئے اور سیاہی بھرا ہوا ہاتھ میز پوش کے کونے میں پونچھنے لگا۔ آس پاس کوئی بھی موجود نہیں تھا، البتہ مینٹل پیس پر رکھی ہوئی گھڑی کی ”ٹک ٹک“ اسے ایسی لگی جیسے کوئی آدمی اس کی حالت پر افسوس ظاہر کرنے کے لئے ”چہ چہ“ کر رہا ہو۔

پرویز چند لمحے گھڑی کو گھورتا رہا پھر اس نے میز پر سے پیپر ویٹ اٹھا کر اس زور سے گھڑی پر مارا کہ وہ بھی جھنجھناتی ہوئی فرش پر آگری۔
راہداری میں قدموں کی آواز سنائی دی اور اس کا بوڑھا نوکر رانودروازے کے سامنے پہنچ کر ٹھٹک گیا۔

”بھاگ جاؤ۔“ پرویز نے چیخ کر دوسرا پیپر ویٹ اٹھایا۔

رانو سامنے سے ہٹ کر چند لمحے وہیں کھڑا رہا اور بچوں کے بل چلتا ہوا دوسری طرف نکل گیا۔ وہ تین سال سے پرویز کے ساتھ تھا اور اس عرصے میں اس نے اسے ایک بار بھی ہتے تو کیا مسکراتے بھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کی دانست میں اس کا آقا دنیا کا عجیب ترین آدمی تھا۔ دنیا کا عجیب ترین جوان، جو انتہائی خوبصورت ہونے کے باوجود بھی اپنی شخصیت کو خاک میں ملا رہا تھا، جو دولت مند ہونے کے باوجود بھی دولت کی طرف سے قطعی بے پروا تھا۔ رانو نے آج تک اس کے کسی دوست کو نہیں دیکھا تھا۔ اس سے کبھی کوئی ملنے کے لئے نہیں آیا تھا۔ اور نہ وہ خود ہی نہیں باہر جاتا تھا۔ اس کا وقت یا تو اس عمارت کے کمروں میں گزر تیا پھر پائیں باغ میں! جب اس نے یہ کوٹھی خریدی تھی تو پائیں باغ کی چار دیواری زیادہ سے زیادہ تین چار فٹ بلند رہی ہوگی، لیکن کوٹھی خریدنے کے بعد اس نے سب سے پہلا کام یہی کیا کہ چار دیواری کافی اونچی کرا دی اور

”رانو....!“ اس نے رانو کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا، جو اس کی طرف پشت کئے کھڑا پائیں باغ میں کچھ دیکھ رہا تھا۔ وہ چونک کر مڑا اور گھبرا کر دو تین قدم پیچھے ہٹ گیا۔

”تم نے بُرا تو نہیں مانا۔“ پرویز آہستہ سے بولا۔

”نہیں سرکار! بالکل نہیں....!“ رانو کی باچھیں کھل گئیں۔ ”مگر سرکار مجھے بڑا دکھ ہوتا ہے۔“

”کس بات کا۔“

”آپ اپنی بالکل خبر نہیں لیتے.... آپ کسی ڈاکٹر....!“

”تو کیا تم مجھے پاگل سمجھتے ہو....“ پرویز نے اس کی بات کاٹ دی۔ لیکن اُس کے لہجے میں

اب بھی نرمی تھی۔

”نہیں صاحب.... مگر آپ کی صحت۔“

”مجھے کیا ہوا۔“ پرویز اپنے چوڑے چکلے سینے اور بازوؤں کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔

”مگر صاحب ریمسوں کی یہ شان نہیں کہ ایک کونے میں بند بیٹھے رہیں۔“

پرویز بُرا سا منہ بنا کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔

”باہر کی دنیا بڑی حسین ہے صاحب۔“ رانو پھر بولا۔

”ہو سکتا ہے۔“

رانو نے محسوس کیا کہ آج پرویز کا موڈ کچھ ٹھیک ہے، ورنہ اس سے قبل کئی بار اس مسئلے پر

جھنجھلا چکا تھا۔ وہ جب بھی اس کی تنہائی پسندی کے سلسلے میں کچھ کہتا پرویز کو غصہ آ جاتا اور وہ اُسے

سخت دست کہہ کر دوسری طرف نکل جاتا۔ اُس نے سوچا کہ آج وہ مسئلہ بھی چھیڑے جس کے

متعلق پوچھنے کی آج تک ہمت نہیں پڑی تھی، نہ صرف رانو بلکہ دوسرے ملازمین بھی اُس معاملے

کی تہہ تک پہنچنے کے لئے بُری طرح بے تاب تھے۔ لیکن اُن میں سے کسی نے بھی پرویز سے کچھ

پوچھنے کی ہمت نہیں کی تھی۔ رانو کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بات کس طرح چھیڑے۔

آخر کار وہ سوچتا ہی رہ گیا.... اور پرویز.... وہ تو کبھی کبھار چاچکا تھا۔

وہ معاملہ تھا بھی بڑا خوفناک! انہیں ڈر تھا کہ کہیں اس کی اطلاع پولیس کو نہ ہو جائے لیکن

خود انہوں نے اس کا تذکرہ باہر کسی سے نہیں کیا۔

بات دراصل یہ تھی کہ اُس کمرے تک اُن کی رسائی ہی نہیں تھی جہاں وہ سب کچھ ہوتا تھا۔

سلاخوں دار پھاٹک بدلو کر ایسا پھاٹک لگوایا جسے بند کر دینے کے بعد دوسری طرف کی چیزیں دیکھائی دیں۔ پڑوسیوں نے بھی اُس کی اس حرکت کو حیرت کی نظروں سے دیکھا تھا۔

رانو کو اس کی ہر عادت غیر معمولی معلوم ہوتی تھی اور ہر مشغلہ انتہائی خوفناک، وہ بعض

اوقات پائیں باغ میں جال لگا کر ننھے ننھے پرندے پکڑتا۔ پھر ان میں سے نروں کو اڑا دیتا لیکن بار

پرنندوں کو ایسی ایسی اذیتیں دے کر مارتا کہ رانو کے رونگھٹے کھڑے ہو جاتے۔ وہ ان کے پرنوچ کر

انہیں ایسی جگہ ڈال دیتا جہاں چوئیاں بکثرت ہوتیں۔ پھر وہ گوشت کے اُن لو تھڑوں کی پھڑک

اتنی محویت سے دیکھتا جیسے اس کی روح نور کے سمندر میں غوطے لگا رہی ہو۔

تیلیوں کو پکڑ کر ان کے پروں کو گوند سے چپکا دیتا اور پھر ان کے ننھے ننھے پروں کو ایک ایک

کر کے بلینڈ سے کاٹتا۔ درختوں پر دوڑتی ہوئی گھریوں پر چاقوؤں سے نشانہ لگاتا اور نوکیلے پھلور

والے چاقو ان کے جسموں سے گذر کر شاخوں میں پیوست ہو جاتے اور وہ اسی طرح پھنسی ہوئی

پھڑپھڑاتی اور کرہناک آوازیں نکالتی رہتیں۔

رانو کبھی اس سے نفرت کرتا اور کبھی اُسے اس پر رحم آنے لگتا۔ رحم اس وقت آتا جب وہ

اُسے یونہی ہلا دہے بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روتے دیکھتا۔

گھر میں چار نوکر تھے جن میں مالی بھی شامل تھا۔ یہ سب اپنے مالک سے بظاہر بیزار تھے لیکن

اُسے چھوڑ نہیں سکتے تھے کیونکہ وہ نوکروں کے معاملہ میں بڑا فراخ دل تھا۔ ان کی فروگزاشتوں پر

انہیں کبھی کچھ کہتا نہیں تھا۔ اخراجات کا حساب تو خیر آج تک لیا ہی نہیں تھا۔ تنخواہیں اچھی خاصی

دیتا تھا۔ ان میں سے اگر کبھی کوئی بیمار ہو جاتا تو ایسی تندہی سے اس کی دیکھ بھال کرتا جیسے وہ اس کا

کوئی عزیز ہو!

بوڑھے رانو کو انیوں کی لت تھی۔ اس کا بار بھی پرویز ہی سنبھالے ہوئے تھا۔ مالی ہر بدھ کی

شام کو شراب ضرور پیتا اور بے طرح پیتا تھا۔ اسکے اخراجات بھی پرویز ہی کی جیب سے نکلتے تھے۔

اور وہ کبھی ان پر خفا بھی ہوتا تو بعد میں معافی ضرور مانگ لیتا۔ لہذا آج بھی یہی ہوا۔ وہ

تھوڑی دیر تک اسی کمرے میں بیٹھا رہا۔ پھر باہر نکل آیا۔ اس کے چہرے پر نرمی کے آثار طاری

ہو گئے تھے اور حلقوں سے اُبل پڑنے والی آنکھیں پھر بوجھل سی نظر آنے لگی تھیں۔ اس کی بچپنی

اویسی لوٹ آئی تھی معمول کے اوقات میں وہ عموماً ایک انتہائی غمزہ آدمی معلوم ہوتا تھا۔

ورنہ نوکر تو آسمان میں تھگی لگاتے ہیں۔ اس کمرے کے دروازے میں ایک براسا قفل پڑا ہوتا تھا جس کے کھلنے اور بند ہونے کا انحصار ہندسوں کی ترتیب پر تھا۔ اور وہ ترتیب پرویز کے علاوہ اور کسی کو نہیں معلوم تھی۔ دروازے کے سارے رخنے بند کر دیئے گئے تھے، اس لئے باہر سے اندر کا جال دیکھنا قطعی ناممکن تھا۔

پرویز کا معمول تھا کہ وہ ہر رات کھانا کھانے کے بعد اس کمرے میں ضرور جاتا تھا اور پھر سارے نوکر لرزنے لگتے تھے۔ کمرے کے اندر سے ”شراب شراب“ کی آوازیں آتیں۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے کوئی کسی پر کوڑے برسا رہا ہو۔ پھر کسی عورت کی چیخیں سنائی دینے لگتیں۔ تھوڑی دیر بعد پرویز باہر نکل کر کمرے کو مقفل کر دیتا۔ اس کے چہرے پر ایسی بے ہمتی ظاہر ہوتی کہ نوکر اس سے آنکھ ملانے کی بھی ہمت نہیں کر سکتے تھے۔

یہ بات آج تک کسی کی سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ وہ عورت کون تھی؟ اور کیا وہ اُسی کمرے میں بند رہا کرتی تھی؟ اگر وہ اس کمرے ہی میں رہتی تھی تو اب تک زندہ کیسے تھی؟ پرویز نے یہ سلسلہ تقریباً دو ماہ سے شروع کر رکھا تھا تو کیا وہ کچھ کھائے بچے بغیر دو ماہ سے زندہ تھی۔ اُس کمرے کا دروازہ دن میں کبھی نہیں کھولا جاتا تھا۔ رات کو بھی پرویز خالی ہاتھ ہی اندر جاتا تھا۔ بہر حال یہ معمہ کسی طرح حل نہیں ہو سکا تھا۔

کبھی کبھی نوکر یہ بھی سوچنے لگتے تھے کہ کہیں وہ کوئی ضعیف روح نہ ہو، رانو اکثر رازدارانہ انداز میں بقیہ نوکروں سے کہتا۔

”صاحب پر ضرور کسی چڑیل کا سایہ ہے، حسین اور تندرست آدمیوں پر اکثر چڑیلیں عاشق ہو جاتی ہیں اور زندگی بھر پیچھا نہیں چھوڑتیں۔“

اس پر مالی کہتا۔

”میں ہوتا تو سالی کی چوٹی کاٹ لیتا۔“

”بڑے تمس مار خاں ہیں۔“ بندو کہتا۔

”اے ہاں ہاں۔“ مالی چھاتی پر ہاتھ مار کر کہتا۔ ”ذرا عاسک ہو کر دیکھے تو سالی، اے میرے دادا نے بھی ایک چڑیل کی چوٹی کاٹی تھی اور مرتے دم تک اسے ازار بند میں باندھے رہے تھے۔“

”بھلا ازار بند میں کیوں باندھے رہے۔“ بندو پوچھتا۔

”بس ازار بند ہی میں تو ہاتھ نہیں لگاتیں۔“ رانو محققانہ انداز میں بولتا۔

”اچھا بابا کیا یہ سچ ہے۔ چڑیلوں کے پنجے پیچھے اور ایڑیاں آگے ہوتی ہیں۔“ رانو اپنے ہونٹوں کو دائرے کی شکل میں لا کر ہلا دیتا۔

”پار اپنے اوپر تو کوئی چڑیل بھی عاسک نہیں ہوتی۔“ بندو آہ بھر کر کہتا۔

”بس کریا میرے! اگر جو کہیں کوئی سن ہی رہی ہو تو۔“ شکور بول پڑتا۔

”بھدا قسم اپنے کو تو چڑیل ہی مل جاتی۔“ بندو اس طرح اکڑ کر کہتا جیسے اپنے ساتھیوں پر ظہر کر رہا ہو کہ وہ چڑیلوں سے نہیں ڈرتا۔

شروع شروع میں انہیں رات رات بھر نیند نہیں آتی تھی لیکن پھر آہستہ آہستہ وہ اس کے مادی ہوتے گئے تھے اور انہیں یقین ہو گیا تھا کہ وہ چڑیل اس کمرے سے نکل کر کم از کم انہیں پریشان نہیں کرے گی، پہلے وہ یہی سمجھتے تھے کہ وہ سچ سچ کوئی عورت ہی ہے، مگر جب کچھ عرصہ گزر گیا تو انہیں اپنا خیال بدل دینا پڑا۔ اگر وہ کوئی عورت تھی تو اس نے اپنی رہائی کے لئے ہنگامہ

لیا نہیں کیا۔ اگر وہ وہاں قید تھی تو کسی وقت دن میں بھی تو اس کی آواز سنی جاتی۔

رانو بڑی دیر تک کھڑا اس معاملے پر غور کرتا رہا۔ پھر اس نے ”اونہہ“ کہہ کر اپنے شانوں کو جھٹک دیا۔ آخر اُسے ان معاملات میں پڑنے کی کیا ضرورت تھی؟ سات بج گئے تھے اور اندھیرا گہرا ہو جا رہا تھا۔ باورچی خانے میں سینوں پر بھونے جانے والے مرغ مسلم کی خوشبو فضا میں تیرتی

پھر رہی تھی۔ رانو نے سچ سے زمین پر تھوک کر آستین سے ہونٹ صاف کئے اور سونے سے قبل والی افون کی چسکی کے خیال میں گن ہو گیا۔ مرغ کی روغن دار ملائم ہڈیوں کا تصور بھی اس کی

روح کی جڑیں سہلانے لگا تھا اس نے سوچا کہ سالامرغ بھی اگر ہاتھی کے برابر ہوتا تو مزہ آ جاتا۔

رانو اندر لوٹ آیا۔ پرویز آنکھیں بند کئے ایک آرام کر سی پڑا تھا۔ اور وہ کھانے کے وقت تک اسی طرح پڑا رہا۔

رانو باورچی جانے کے دروازے پر آکر بیٹھ گیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ صاحب زیادہ ہے زیادہ ایک ٹانگ کھائیں گے۔ کاش دوسری ٹانگ اسے مل جاتی۔ مگر وہ سالامرغ بھلا کیوں اسے دینے لگا۔

وہ ٹانگ کھلائے گا۔ شکور اُکو جو اُسے اکثر اپنے ایک عزیز کے یہاں لے جاتا ہے۔ جسکی لونڈیا کرمیوں کے بھی کان کاٹتی ہے۔ اُس کے جھٹے میں شاید پیٹھ کی ہڈی آئے۔

گھڑی نے آٹھ بجائے۔ پرویز کھانا کھا کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ ملازموں نے برتن اور باورچی خانے میں آ بیٹھے۔ رانو نے پہلے ہی تہیہ کر لیا تھا کہ جس طرح بھی ممکن ہو گامرغ کی ٹاء ہی پر ہاتھ مارے گا۔ لہذا کھانا سامنے رکھ کر انہوں نے جھگڑنا شروع کر دیا۔ مانی رانو کا طر فدار ہوئے
 ”میں خوب سمجھتا ہوں۔“ رانو سر ہلا کر بولا۔ ”مگر بیٹا اس سے کچھ نہیں ہوتا۔“
 ”لو! تھرو۔“ بندو نے پورا مرغ رانو کے سامنے پیش دیا۔

”مطلب کیا ہے تیرا۔۔۔؟“ رانو بگڑ کر کھڑا ہو گیا۔
 ”چل بیٹھ بھی بابا۔“ شکور اُس کا ہاتھ پکڑ کر بٹھاتا ہوا بولا۔ ”چل تو ہی کھالے۔ ہی ہی ہی۔“
 ”اب تو سالے پر تھوکوں بھی نہیں۔“ رانو نے پانی کا گلاس ہونٹوں سے لگاتے ہوئے کہا۔
 ”آج اسی کی بات مان لیتے۔“ مانی بڑبڑایا اور پھر بندو بھی پھٹ پڑا۔
 لیکن ان کا یہ جھگڑا دیر تک قائم نہ رہ سکا۔ پہلے انہوں نے کسی عورت کی چیخ سنی اور اس بعد ہی کسی مزدور کی چیخ سنا دی۔

چاروں حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔
 ”صاحب۔“ رانو نے آہستہ سے کہا اور چاروں کھڑے ہو گئے کیونکہ پرویز کی چیخ انہوں پہلی بار سنی تھی۔

پھر وہ چاروں اس کمرے کی طرف دوڑے۔ راہداری میں اندھیرا تھا۔ انہوں نے قریب کسی کی گہری گہری گہری سانسون کی آواز سنی۔

”رانو۔۔۔۔۔ بندو۔۔۔۔۔!“ پرویز کی گھٹی گھٹی آواز آئی۔ ”روشنی۔“
 اس راہداری کا بلب کئی دن ہوئے فیوز ہو گیا تھا اور ابھی تک اُسے بدلا نہیں گیا تھا اس۔
 یہاں عموماً اندھیرا ہی رہتا تھا۔

بندو مارچ لانے کے لئے دوڑا۔
 ”کیا بات ہے صاحب۔“ رانو نے پوچھا۔
 ”بات۔۔۔۔۔ بات۔۔۔۔۔ پتہ نہیں۔“ پرویز ہانپتا ہوا بولا۔

اتنے میں مارچ آگئی۔ نوکروں نے پرویز کی حالت کو بڑی حیرت کی نظروں سے دیکھا۔
 کی آنکھیں خوف سے پھیل گئی تھیں۔ چہرے پر پسینے کی بوندیں پھوٹ رہی تھیں اور وہ اس طر

ہانپ رہا تھا جیسے دے کا مریض ہو۔ اُس نے مڑ کر اس پڑاسرار کمرے کی طرف دیکھا جس کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ پھر اس نے کپکپاتے ہوئے ہاتھ سے مارچ پکڑی اور کمرے کی طرف بڑھنے لگا۔ نوکر خوفزدہ تھے، اس لئے ان میں سے کسی نے بھی آگے بڑھنے میں جلدی نہیں کی، وہ آٹھ دس قدم پیچھے ہی تھے کہ پرویز کمرے میں داخل ہوا اور نوکروں نے پھر اس کی چیخ سنی، وہ جہاں تھے وہی رک گئے۔ ہر ایک کے دل کی دھڑکنیں اس کے سر میں دھمکتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں، وہ دم بخود کھڑے رہے۔ انہیں شاید پرویز کے پکارنے کا انتظار تھا۔ پھر انہوں نے پرویز کو کمرے سے نکلنے دیکھا۔ مارچ روشن تھی اور وہ لڑکھاتا ہوا راہداری طے کر رہا تھا۔ وہ ان کے قریب سے گزر گیا ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اُسے ان کی موجودگی کا علم ہی نہ ہو۔

وہ بھی اس کے پیچھے چل پڑے۔ اس نے ایک بار بھی پلٹ کر ان کی طرف نہیں دیکھا۔
 برآمدے میں پہنچ کر وہ اسی آرام کر بی پر گر گیا جس پر شام سے لیٹا ہوا تھا۔
 ”صاحب۔“ رانو سہمی ہوئی آواز میں بولا۔ ”کیا بات ہے؟“
 ”پانی۔۔۔۔۔!“ پرویز کی آواز میں بہت زیادہ تھاہت تھی۔

پانی پی چکنے کے بعد اُس نے پھر آنکھیں بند کر لیں اور پھر کسی نے بولنے کی ہمت نہیں کی۔
 رانو سوچ رہا تھا کہ وہ آج اس کمرے کو کھلا ہی چھوڑ آیا ہے؟۔۔۔۔۔ آخر کیوں؟۔۔۔۔۔ اور آج وہ خود بھی کیوں دوبار چیخا تھا؟

”پولیس کو فون کر دو۔“ پرویز تھوڑی دیر بعد بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔
 ”پولیس کو۔۔۔۔۔!“ رانو تقریباً چیخ پڑا۔
 ”ہاں۔“

”کس لئے صاحب! کیوں؟“
 ”میں نے اُسے مار ڈالا ہے۔“
 ”کسے؟“ رانو کا دم گھٹنے لگا۔

”ان سے کہہ دو کہ میں بے گناہ ہوں۔۔۔۔۔ میں نے اُسے مار ڈالا ہے۔۔۔۔۔ میرے خدا۔۔۔۔۔“
 ”یہی ہے؟ تم ابھی تک گئے نہیں! نو! کو تو ابی کا نمبر تین سو پندرہ دے۔۔۔۔۔ جاؤ۔“
 ”کیا کہہ دوں۔“ رانو تھوک نکلتا ہوا بولا۔

”بہرے ہو! کیا سنا نہیں۔“ پرویز اس طرح بولا جیسے خود اسے اپنی آواز نہ سنائی دے رہی ہو۔ ”کہہ دو یہاں قتل ہو گیا ہے۔“

پُر اسرار لاش

سر جنٹ حمید نے اندھیرے میں ٹھوکر کھائی اور گرتے گرتے بچا۔ فریدی نے پلٹ کر ٹارو کی روشنی ڈالی اور حمید بیٹھ کر اس پتھر کو سہلانے لگا جس سے ٹھوکر لگی تھی۔

”یہ کیا حماقت؟“ فریدی جھنجھلا کر بولا۔

”برابر کر رہا تھا، کہیں بُرا نہ مان گیا ہو۔“

”بالکل ہنسی نہیں آئی۔“ فریدی نے شک لہجے میں کہا۔

”ظاہر ہے کہ اس پتھر نے بھی میرے معانی مانگنے پر مسکرا کر یہ نہیں کہا کہ کوئی بات نہیں۔“

”اٹھو نہیں تو ٹھوکر مارتا ہوں۔“ فریدی بولا۔

”البتہ اس معاملے میں پتھر آپ سے زیادہ بلند واقع ہوا ہے۔“ حمید نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”میں سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں کہ تم ہنسنے ہنسانے کے چکر میں پڑ کر بالکل احمق ہو گئے ہو۔“

فریدی بولا۔

”اور میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ آپ اس پتھر سے بھی بدتر ہیں۔“

”بکومت! زیادہ بچپنا بھی کھلنے لگتا ہے۔“

”شاید پانچ سو پچھتر ویں بار آپ یہ جملہ دہرا رہے ہیں۔“ حمید نے سنجیدگی سے کہا۔ ”کی“

ہے کہ پانچ سو چھتر ویں بار بھی آپ یہی جملہ دہرائیں گے۔ لہذا اب اس میں کچھ رد و بدل کیجئے۔

فریدی کچھ نہ بولا۔ حمید نے پھر کہا۔

”بہتر یہ ہوگا کہ اس جملے کی ترتیب بدل دیجئے۔ مثلاً زیادہ کھلنے بھی لگتا بچپنا۔ مت بکو؛

اس جملے کے الفاظ کے شروع کے حروف میں الٹ پھیر کر دیجئے جیسے بت بکو! زیادہ زچپنا سہمی۔“

گہٹائے۔۔۔ یا پھر آخر کے حروف۔“

”یار خدا کے لئے پیچھا چھوڑو۔“

”چھوڑ دیا۔“ حمید لاپرواہی سے بولا۔ ”لیکن میں کل سے اس چکر میں نہیں پڑوں گا۔“

”وہ تو پڑتا ہی ہوگا۔“

”سنئے جناب!“ حمید جھلا کر بولا۔ ”یا تو میں خود کشی کر لوں گا یا اس ڈاکٹر کو گولی ماز دوں گا جس

نے آپ کو ہواخوری کا مشورہ دیا ہے۔ بھلا کوئی تک ہے۔ سارے شہر کا بیدل چکر لگاتے پھرے۔“

”خود کشی سے بہتر تو یہ ہوگا کہ تم کسی تندرست آدمی کے ساتھ کہیں بھاگ جاؤ جو تمہیں

کما کر کھلا سکے۔“

”بالکل نہیں۔۔۔۔۔ چاہیہ جملہ۔“ حمید کھر کھراتی ہوئی آواز میں بولا۔

”فکر نہیں۔“

”اور یہ بھی نہیں کہ سڑکوں ہی کے چکر کاٹے جائیں۔“ حمید تھوڑی دیر بعد بولا۔

”بکھائیاں اور تالے بھی پھلانگئے۔ ڈاکٹر نے دھکے کھانے کے لئے نہیں، ہواخوری کے لئے

کہا تھا۔ ساری دنیا اتنی ترقی کر گئی ہے، مگر اپنے یہاں کے ڈاکٹر ڈیوٹ کے ڈیوٹ ہی رہے۔ اس

زمانے میں جب کہ سارے کام مشینوں سے لئے جا رہے ہیں نہ جانے ہواخوری کم بخت کیوں

رجعت پسندی کے چکر میں پھنسی ہوئی ہے۔“

”اوہو۔۔۔۔۔ تو آپ ہی سوچئے نا کوئی ترقی یافتہ طریقہ۔“ فریدی طنزیہ لہجے میں بولا۔

”سوچ لیا ہے؟“ حمید نے انکر کر کہا۔

”فرمائیے۔“

”سائیکل کا پمپ۔۔۔۔۔ گھر بیٹھے ہواخوری فرمائیے۔“

فریدی ہنس پڑا۔

”ترکیب استعمال کیلئے پتہ لکھا ہوا الفاظ اور چار آنے کے ٹکٹ ار سال فرمائیے۔“ حمید پھر بولا۔

”چلتے رہو چپ چاپ۔“ فریدی نے اُسے دھکا دیا۔

”سچ کہتا ہوں زندگی سے جی اُچاٹ ہو گیا ہے۔“ حمید نے کسی تھکے ہوئے بوڑھے کی طرح

کہا۔ ”اب میں یقینہ زندگی یاد خدا میں گزارنے کے لئے جنوبی امریکہ چلا جاؤں گا۔ یہ بھی کوئی

زندگی ہے۔ بس تھکتے رہو۔ اس کی ضرورت ہو یا نہ ہو۔ اگر کچھ کام نہیں تو بیدل چلو۔“

فریدی خاموشی سے چلتا رہا۔ وہ پانچ بجے سے اب تک کئی میل کا چکر لگا چکے تھے۔ ادھر کئی

رتی ہیں۔ بڑے دانتوں والی حاسد اور خشکی ہوتی ہے اور بھی نہ جانے کیا کیا آلا بکلا۔“

”تو کیا یہ بدبودار باتیں تھیں۔“ حمید نے بھنا کر پوچھا۔

”نہیں بڑی اونچی باتیں تھیں۔“ فریدی خشک لہجے میں بولا۔

”بہر حال آپ کل سے مجھے اس طرح نہیں ٹھہلا سکتے بھلا کوئی تک ہے... واہ...؟“

”اوہ...!“ دفعاً فریدی چلتے چلتے رک گیا۔ وہ اس وقت ایک آبادی کی پشت سے گذر رہے تھے۔ انکی بائیں طرف بڑی بڑی عمارتوں کا ایک لائقناہی سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ حمید بھی رک گیا۔

نارچ کی روشنی کا دائرہ ایک عمارت کی دیوار پر جم گیا تھا۔

”نقب...!“ فریدی حمید کی طرف مڑ کر بولا۔

دیوار میں ایک اتنا بڑا سوراخ نظر آ رہا تھا جس سے ایک آدمی بیچہ کر رہا تھا۔ آسانی گذر سکتا تھا۔

پار سے نکالی ہوئی اینٹیں نیچے ڈھیر تھیں۔ فریدی نے ادھر ادھر دیکھا یہ عبارت دوسری عمارتوں سے قطعی الگ تھی۔

وہ دونوں دیوار کے نیچے آگئے۔ چاروں طرف گہرا انسانا تھا اور جھینگروں کی مسلسل جھانک

بائیں بھی اندھیرے ہی کا ایک جزو معلوم ہو رہی تھی۔ فریدی نے نارچ بچھا دی اور دیوار سے

دھڑکھڑا کر اٹھ گیا۔ پھر اس نے ایک پتھر اٹھا کر نقب کے مہرے میں پھینکا جس کے گرنے کی آواز

آئی دی۔ اس کے بعد پھر سناٹا چھا گیا۔

دوسرے لمحے میں وہ دونوں اندر پہنچ گئے اور نارچ کی روشنی زمین پر پڑتے ہی حمید اچھل کر

پچھلے ہٹ گیا۔ ایک عورت کمرے کے فرش پر اونڈھی پڑی تھی۔

”کیا مطلب...!“ حمید نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے سرگوشی کی۔

اس کمرے میں دوسری طرف ایک ہی دروازہ تھا جو کھلا ہوا تھا۔ کھڑکیاں نہیں تھیں۔ ایک

دف ایک بڑا سا لکڑی کا صندوق رکھا ہوا تھا۔ اسی کے سامنے دوسرے گوشے میں ایک چھوٹی سی

لی میز تھی، جس پر سیاہ رنگ کا ایک بکس تھا۔

فریدی تھوڑی دیر تک عورت پر جھک رہا پھر سیدھا کھڑا ہو گیا۔

”لاش...!“ اس نے آہستہ سے کہا۔

”خدا آپ پر رحمت نازل کرے۔“ حمید بڑبڑایا۔

دونوں سے فریدی نے اپنے ایک ڈاکٹر دوست کے مشورے پر ہواخوری کا مشغلہ شروع کر دیا۔ اس کے ساتھ حمید کو بھی گھسٹنا پڑتا تھا۔ یعنی اس کا وہ فالٹو وقت جو رقص گاہوں اور ٹائٹ کلبر میں صرف ہوتا تھا اب ہواخوری کی نذر ہو گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ حمید نے اس پر ضرورت سے زیادہ ہل چایا ہوگا۔ تاہم اسے دراصل اس بات پر آتا تھا کہ آخر یہ خواہ مخواہ ہواخوری کا بھوت کیوں سوار ہو گیا۔ ہواخوری یا پیدل چلنے کا مشورہ انہیں لوگوں کو دیا جاتا ہے، جو کسی مرض میں مبتلا ہوں، لیکن یہاں اس قسم کی کوئی بات نہیں تھی۔

”تو آپ نہیں بتائیں گے؟“ حمید تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد بولا۔

”کیا...؟“

”یہی کہ آخر ڈاکٹر نے یہ مشورہ دیا ہی کیوں؟“

”اس لئے کہ آج کل تمہیں گہری نیند آتی ہے۔“ فریدی نے سنجیدگی سے کہا۔

”مجھے...!“ حمید بوکھلا کر بولا۔

”ہاں... ہاں تمہیں۔“

”اور اس نے مشورہ آپ کو دیا ہے۔“

”یہ مشورہ میں نے تمہارے ہی لئے طلب کیا تھا۔“

”یعنی اتنے دنوں سے آپ مجھے الو بنا رہے ہیں۔“

”الو نہیں آدمی بنا رہا ہوں۔ الو تو تم سوتے وقت ہو جاتے تھے۔ ادھر سے البتہ اس الوینہ

میں کچھ افادہ معلوم ہوتا ہے۔“

”یعنی...!“

”سوتے وقت اس بُری طرح شور مچاتے تھے کہ خدا کی پناہ... اور یوں کہ ساری باتیں

صاف سمجھ میں آتی تھیں اور وہ ساری باتیں اتنی بدبودار ہوتی تھیں کہ ناک پھٹنے لگتی تھی۔“

”مثلاً...!“

”مثلاً یہ کہ ہائے کیا رنگت ہے۔ ارے مار ڈالا، کیا مسکراہٹ ہے، چال ہے کہ قیامت

یہی نہیں بلکہ عورتوں کی قسمیں اور ان کے عادات و خصائل بھی گنوانے لگتے ہو۔ لمبی ناک و

نفاست پسند ہوتی ہے۔ چھوٹی آنکھ والی خوشامد پسند اور کینہ توز ہوتی ہے۔ کلویاں گاڑھی مج

”تم یہیں ٹھہرو۔“ فریدی نے کہا اور دروازے سے نکل گیا۔ راہداری سنسان پڑی تھی دے پاؤں چل رہا تھا۔ راہداری کے سرے پر پہنچ کر اُس نے آوازیں سنیں۔ وہ کچھ دیر کے رکاوڑ پھر یک دم برآمدے میں آگیا۔ گفتگو کرنے والے ٹھٹھک گئے اور وہ جو آرام کرسی پر چھل کر کھڑا ہو گیا۔

فریدی انہیں تیز نظروں سے گھوڑتا رہا، بقیہ چار آدمی نوکر معلوم ہوتے تھے۔

”کیا بات ہے؟“ فریدی نے خود ہی سکوت توڑا۔

”آپ کون ہیں؟“ پرویز کی آواز میں خوف تھا۔

”کیا آپ اس سے واقف ہیں کہ اس عمارت کے ایک کمرے میں.....!“ فریدی کا جملہ ہونے سے پہلے ہی پرویز پھوٹ پڑا۔

”میں بے قصور ہوں..... وہ میرے ہاتھوں مری ہے۔ مگر میں بے قصور ہوں۔“

فریدی نے محسوس کیا جیسے وہ ہوش میں نہ ہو۔

”وہ کون ہے؟“ فریدی نے پوچھا۔

”وہ.....!“ پرویز اس طرح چونکا جیسے یک سوئے جاگ پڑا ہو۔ ”وہ کون۔“

اس کی آنکھیں آہستہ آہستہ بند ہونے لگیں اور ہونٹوں پر ایک خفیف سی مسکراہٹ کی دکھائی دی پھر اگر فریدی آگے بڑھ کر اُسے سنبھال نہ لیتا تو وہ سیدھا زمین پر ہی آیا ہوتا۔ آنکھیں بند تھیں اور سانسیں رک رک کر آرہی تھیں۔ فریدی نے اُسے آرام کرسی پر ڈال دیا۔

”کیا بات ہے۔“ فریدی نوکر کی طرف مڑا۔

وہ سب ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

”فون ہے یہاں۔“ فریدی نے پھر سوال کیا۔

”نہیں.....!“ رانو ہٹکایا۔ ”پڑوس میں ہے۔“

”کوئی ڈاکٹر قریب ہے۔“

”جی ہاں.....!“

”بلا لاؤ اُسے، میں پولیس کا آدمی ہوں۔“

رانو جانے لگا۔

”ٹھہرو.....!“ فریدی نے کہا اور راہداری کے سرے پر جا کر حمید کو آواز دی۔ حمید شاید راہداری ہی میں فریدی کی آواز پر دوڑ پڑا۔

”ان کے ساتھ جاؤ۔“ فریدی نے رانو کی طرف اشارہ کر کے حمید سے کہا۔ ”کو تو لی فون کر دینا..... اور ڈاکٹر.....؟“

حمید نے پرویز کی طرف دیکھا۔

”بیہوش ہو گیا ہے۔“ فریدی نے کہا۔ ”جلدی کرو۔“

حمید رانو کے ساتھ چلا گیا۔

”وہ عورت کون ہے؟“ فریدی نے بقیہ نوکروں سے پوچھا۔

”کون عورت.....؟“ تینوں بیک وقت بولے اور فریدی حیرت سے انہیں دیکھنے لگا۔

”کیا یہاں چوری بھی ہوئی ہے؟“

”نہیں تو.....!“ شکور بولا۔ شاید اُس نے اپنے خوف پر قابو پا لیا تھا۔ تھوڑی دیر رک کر اُس نے کہا۔ ”مگر صاحب نے ابھی پولیس کو فون کرنے کے لئے کہا تھا۔“

”میرے ساتھ آؤ۔“ فریدی نے کہا اور راہداری کی طرف جانے لگا۔ سرے پر پہنچ کر وہ مڑا۔ تینوں نوکروں نے اپنی جگہ سے جنبش تک نہیں کی تھی۔

”کیوں.....؟“ اس کی آواز بلند ہو گئی۔

”آپ ہیں کون۔“ بندو خور فزہ آواز میں بولا۔ ”اندر کیسے آئے۔ پھانک تو بند ہے۔“

”میں تمہیں یہی دکھانا چاہتا ہوں کہ میں کیسے آیا۔“ فریدی نے نرم لہجے میں کہا۔

مالی آنکھیں پھاڑے فریدی کو دیکھ رہا تھا۔ دفعتاً اُسکے منہ سے بے ہنگم سی آوازیں نکلنے لگیں۔

”اُسے اُسے۔“ بندو اور شکور روہانسی آواز میں چیخے اور پھر انہوں نے بھی مالی کے سر میں سر ملانا شروع کر دیا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے تینوں کو فرحنگ ہو گئی ہو۔

”چپ رہو۔“ فریدی انہیں ڈانٹ کر ان کی طرف بڑھا لیکن اُس کے قریب پہنچنے سے پہلے ہی تینوں لہرا کر زمین پر گر پڑے۔

”کیا مصیبت ہے۔“ فریدی دانت پیس کر بولا۔ وہ تینوں بھی بیہوش ہو چکے تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کرے۔ کبھی وہ راہداری کی طرف دیکھتا تھا اور کبھی چاروں کی طرف۔

ایک خیال تیزی سے اُس کے ذہن میں گونجا۔ کہیں یہ مکاری تو نہیں کر رہے ہیں۔ پرویز اعتراف جرم اُسے یاد آ رہا تھا۔ ساتھ ہی نوکروں کی لاعلمی بھی اس کے ذہن میں تھی۔ انہوں نے گھر میں کسی عورت کے وجود سے لاعلمی ظاہر کی تھی۔ پھر وہ نقب؟ آخر بات کیا ہے؟ وہ دس پندرہ منٹ تک خیالات میں کھویا رہا۔ چاروں آدمی ابھی تک بیہوش پڑے تھے۔ قدموں کی آواز سن کر وہ چونکا۔ حمید اور رانو ڈاکٹر کو لے آئے تھے۔

”اوہ.... یہ بھی گئے۔“ حمید نوکروں کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”مجھے یقین تھا کہ ایسا ضرور ہو گا۔“

”کیوں....؟“

”بوڑھے سے جو کچھ معلوم ہوا تھا اس کی بناء پر میں نے یہی اندازہ لگایا تھا۔“

فریدی اس پر کوئی دوسرا سوال کرنے کی بجائے ڈاکٹر کی طرف مڑا، جو پرویز پر جھکا ہوا اُسے دیکھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اُس نے سر اٹھا کر کہا۔

”یہ بیہوش نہیں! نیند ہے۔ گہری نیند، جو شاید آسانی سے نہ ٹوٹ سکے۔ کیا یہ اکسونیا (خوابی) کا مریض ہے۔“

”پتہ نہیں۔“ فریدی آہستہ سے بڑبڑایا۔

تینوں نوکروں کے متعلق ڈاکٹر نے بتایا کہ ان کی بیہوشی کی وجہ غالباً خوف ہے۔

”ایک لاش بھی ہے۔“ فریدی نے ڈاکٹر سے کہا۔

”لاش....! ڈاکٹر کی آنکھیں پھیل گئیں۔

”جی ہاں۔ میرے ساتھ آئیے۔“ فریدی نے کہا اور حمید سے بولا۔ ”تم یہیں ٹھہرو۔“

پھر وہ رانو کو بھی اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کرتا ہوا رہداری کی طرف بڑھ گیا۔

لاش دیکھ کر رانو چیخ پڑا۔ فریدی نے آگے بڑھ کر لاش سیدھی کردی اور رانو سے پوچھ

”یہ کون ہے؟“

”ہم.... میں.... نہیں جانتا۔“

”کبھی نہیں دیکھا....؟“

”نہیں.... کبھی نہیں۔“ رانو نے کہا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر نقب کی طرف دیکھنے لگا۔

ڈاکٹر لاش کو دیکھتا رہا۔ اس نے فریدی کے ہاتھ سے نارنج لے کر مقتولہ کی گردن دیکھی

کہا: ”اہو کر بولا۔“

”آخر بات کیا ہے۔ پولیس کو اطلاع ہوئی یا نہیں۔ اسے گلا گھونٹ کر مارا گیا ہے۔“

”میرا تعلق محکمہ سراغ رسانی سے ہے۔“ فریدی نے کہا۔ ”اور بات ابھی تک میری سمجھ میں بھی نہیں آئی۔“

ریوالور کی کہانی

پولیس آگئی تھی۔ حمید نے خاص طور سے جگہ لیش کو فون کیا تھا اور اتفاق سے وہ اُس وقت رانو تو ابھی ہی میں موجود تھا۔ تینوں نوکروں کو ہوش آ گیا تھا۔ لیکن پرویز کی حالت بدستور وہی تھی۔ ڈاکٹر نے بھی اُس کے سلسلے میں کوئی قطعی فیصلہ کرنے سے گریز کیا تھا۔ نوکروں سے پوچھ گچھ پر یہ بات ثابت ہو گئی تھی کہ وہ حقیقتاً بے خوابی کا مریض تھا۔ اکثر پندرہ پندرہ دن تک اُسے نیند نہیں آتی تھی۔

پرویز اور اُس کی مشغولیات کے متعلق ہر ایک نے حیرت سے سنا۔ رانو کا بیان دوسروں سے زیادہ مربوط اور واضح تھا اس لئے فریدی بار بار اسی سے سوال کر رہا تھا۔

”ہم یہاں تین سال سے ہیں۔“ رانو کہہ رہا تھا۔ ”لیکن ہم نے یہاں کبھی کوئی عورت نہیں دیکھی۔“

”اور تمہیں یہ یقین ہے کہ وہ نقب آج ہی کسی وقت لگائی گئی ہے۔“ فریدی نے پوچھا۔

”جی ہاں! کل میں پچھواڑے کی طرف سے گذرا تھا۔ اس وقت میں نے نقب نہیں دیکھی تھی۔“

”اپنے مالک کی پچھلی زندگی کے متعلق بھی کچھ جانتے ہو۔“

”جی نہیں! نہ مجھے اُن کے رشتے داروں ہی کے متعلق کچھ معلوم ہے۔“

”کیا وہ ہمیشہ سے عجیب و غریب حرکتیں کرتا رہا ہے۔“

”میں نے ابھی بتایا نا آپ کو۔ کمرے والا معاملہ شاید دو ڈھائی ماہ پہلے شروع ہوا تھا۔“

”تو یہاں کبھی کوئی آتا ہی نہیں تھا۔“ فریدی نے سگار سلگاتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں.... اوہ ٹھہریے.... جی ہاں چینی ہی معلوم ہوتا تھا۔“

”تم پھر بہنے لگے۔“

”نہیں حضور! اب سے ڈھائی تین ماہ پہلے ایک چینی صاحب کے پاس آیا تھا۔ وہ اپنے ساتھ ایک بہت بڑا صندوق لایا تھا۔ وہی صندوق جو ابھی آپ نے اس کمرے میں دیکھا ہے۔“

فریدی چونک کر رانو کو گھورنے لگا پھر آہستہ سے بولا۔

”اور اسی کے بعد ہی سے تمہیں اس کمرے میں کسی عورت کی چیخیں سنائی دینے لگی تھیں۔“

”جی ہاں۔۔۔!“ رانو جلدی سے بولا۔

فریدی تھوڑی دیر تک کچھ سوچتا رہا پھر بولا۔

”تمہارے مالک کے پاس خطوط وغیرہ بھی آتے رہے ہوں گے۔“

”آتے تھے اور اکثر کتابوں کے پارسل بھی آیا کرتے تھے۔ صاحب بھی خطوط لکھا کرتے تھے۔“

”کہاں سے آئے تھے۔“

”یہ تو نہیں بتا سکتا۔ میں پڑھا لکھا نہیں۔“

”تمہارے ساتھیوں میں سے کوئی بتا سکے گا۔“

”جی نہیں وہ بھی میری ہی طرح ہیں۔“

”مگر تمہارا بولچہ تو پڑھے لکھے لوگوں جیسا ہے۔“

”صحبت کا اثر ہے سرکار! میں ہمیشہ بڑے ہی لوگوں کے پاس رہا ہوں۔“

”تمہارے مالک کا ذریعہ معاش کیا تھا۔“

”یہ میں نہیں جانتا لیکن بینک سے میں ہی روپے لایا کرتا ہوں۔“

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی پھر وہ سب لاش والے کمرے میں دوبارہ آئے۔ لاش ابھی تک وہیں پڑی تھی۔ فریدی نے اُس بڑے صندوق کا ڈھکن اٹھایا جس کے متعلق رانو نے بتایا تھا۔ اس میں لمبے ریشوں والی خشک گھاس اور کاغذ کی ردی بھری ہوئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس میں کبھی کوئی چیز پیک کی گئی ہو۔ فریدی کے اشارے پر کانشیلوں نے صندوق میں بھری ہوئی گھاس فرش پر الٹ دی۔ فریدی دیر تک اُسے مارچ کی روشنی میں دیکھتا رہا پھر حمید نے دیکھا کہ وہ ایک کاغذ کا ٹکڑا تہہ کر کے اپنی جیب میں رکھ رہا ہے۔

”یہ تو ظاہر ہے کہ جو کچھ بھی ہو اندھیرے میں ہوا۔“ فریدی چاروں طرف مارچ کی روشنی

ڈالتا ہوا بولا۔

”کیوں اندھیرے میں کیوں؟“ جلد لیش بولا۔

”تم دیکھ رہے ہو کہ یہاں اس کمرے میں الیکٹرک فٹنگ نہیں ہے۔“ فریدی نے آہستہ سے

کہا۔ ”اور مجرم یہاں جو کچھ بھی کرتا رہا ہے اس کے لئے اس نے موم بتیاں استعمال کی ہیں۔ کیا یہ

پگھلی ہوئی موم بتیوں کا موم نہیں ہے؟“ اس نے ایک طاق کی طرف اشارہ کیا۔ کچھ دیر چپ رہ کر

پھر بولا۔ ”لیکن آج یہاں موم بتی بھی نہیں تھی۔ غالباً مجرم کو یہ یاد نہیں کہ کمرے میں موم بتی

نہیں ہے۔“

”لیکن وہ آوازیں جو روزانہ سنی جاتی تھیں۔“ حمید نے کہا۔ اس کا کیا مطلب تھا۔ اس عورت

کے متعلق تو یہی سوچا جاسکتا ہے کہ یہ اس نقب کے ذریعے اندر داخل ہوئی۔

”اور! پرویز نے اس پر حملہ کیا تھا؟ اگر یہ صورت بھی تھی تو گلا گھونٹ دینے کی کوئی وجہ سمجھ

میں نہیں آتی۔ پرویز اسے مار ڈالے بغیر بھی بے دست و پا کر سکتا تھا۔ کیونکہ وہ جسم کی بناوٹ کے

اعتبار سے کافی طاقتور معلوم ہوتا ہے اور اس عورت کو تم دیکھ ہی رہے ہو۔“

”ممکن ہے پرویز بھی اُسے بھوت ہی سمجھا ہو۔“ حمید نے کہا۔ ”جس طرح نوکر آپ کو

بھوت سمجھتے تھے۔ اس کمرے سے متعلق ساری چیزیں ان لوگوں کی طرح پُر اسرار ہیں۔“

”پرویز کے لئے نہیں ہو سکتیں۔“ فریدی کچھ سوچتا ہوا بولا۔ ”کیونکہ اس کے پُر اسرار بنانے

کا ذمہ دار وہی ہے۔“

”میرے خیال سے اس عورت کے متعلق پڑوس میں چھان بین کرنی چاہئے۔“ حمید نے کہا۔

”نوکر فراڈ ہیں۔“ حمید نے منہ بنا کر کہا۔ ”سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ نے اس کہانی پر اعتبار

کیسے کر لیا۔“

”محض اس لئے کہ اُن تینوں نوکروں کی بیہوشی مصنوعی نہیں تھی اور نہ اُن آوازوں میں

بناوٹ تھی جو بیہوش ہونے سے قبل اُن کے حلق سے نکلی تھیں۔“

”ڈاکٹر بھی اُن کا پڑوسی ہے۔“ حمید نے کہا۔ ”ممکن ہے وہ بھی اس سازش میں شریک ہو۔“

”یوں تو ہم بھی اسی نقب کے ذریعے اندر داخل ہوئے تھے۔“ فریدی نے مسکرا کر

کہا۔ ”ہو سکتا ہے کہ ہم نے ہی اس عورت کو یہاں بھیجا ہو۔ کیوں بھی جلد لیش؟“

جلد لیش ہنسنے لگا۔

”پرویز کی نیند....!“ حمید مضحکہ انداز میں مسکرایا۔ ”اس نیند کے متعلق کیا خیال ہے۔“

”کیا تم سمجھتے ہو کہ ڈاکٹر کی تشخیص غلط ہے۔“ فریدی اس کی طرف مڑا۔

”میں نے تو ایسی نیند کے متعلق آج تک نہیں سنا، جو بیہوشی سے بھی زیادہ گہری ہو۔“

”کیوں؟ کیا نواب سادجہت مرزا کی نیند تمہیں یاد نہیں۔“

حمید جواب دینے کی بجائے لاش کی طرف دیکھنے لگا۔

”میں نے شاید اسے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔“ وہ تھوڑی دیر بعد بولا۔

تب تو معاملہ صاف ہے فریدی نے سنجیدگی سے کہا۔ ”تم بھی اس سازش میں شریک مہوتے ہو۔ ورنہ اس وقت میرا اور تمہارا یہاں کیا کام! تم مجھے اس طرف لائے ہی کیوں تھے۔“

”میں لایا تھا۔“ حمید بھٹا کر بولا۔

”شاید آپ انہیں پھر پھنسانا چاہتے ہیں۔“ جگدیش نے ہنس کر کہا۔

تھوڑی دیر بعد لاش اٹھوا دی گئی اور وہ لوگ برآمدے میں آ بیٹھے۔ پرویز اب تک آکر

کرسی پر تھا۔

”بیہوش ہونے سے قبل اس نے اعتراف جرم کیا تھا۔“ فریدی بولا۔ ”لیکن یہ ہے کون؟“

اس کے ملازمین اس کے متعلق کچھ نہیں جانتے۔ ویسے آدمی دولت مند معلوم ہوتا ہے۔“

فریدی کھڑا ہو گیا۔

”تم لوگ یہیں ٹھہرو۔“ اس نے کہا اور باہر نکل گیا۔

”اب دیکھئے۔“ حمید بولا۔ ”تھوڑی ہی دیر ٹھہرنا پڑتا ہے یا قیامت نکلا۔“

”آپ بُری طرح اکتائے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔“ جگدیش نے کہا۔

”معلوم ہوتا ہوں۔ چہ خوب! گویا آپ کو اس میں شبہ ہے۔“

”اتنا عمدہ کیس ملا ہے آپ لوگوں کے شایان شان۔“

”کیا....؟“ حمید چیخ کر بولا۔ ”گویا میں کیسوں کے لئے مرا کرتا ہوں۔“

”نہیں بڑے بھائی بگڑتے کیوں ہو۔“ جگدیش ہنس پڑا۔

”تم نہیں جانتے کہ میں اس وقت کتنا دکھی ہوں۔“

”کیوں....؟“

”کسی عورت کی لاش دیکھ کر مجھے سب سے پہلے یہی خیال آتا ہے کہ اس کی زندگی میں اُسے کیوں نہ ملا۔“

”فرض کیجئے کہ آپ زندگی ہی میں اس سے مل لئے ہوتے تو۔“

”تو اس وقت میں ایک ہی نظر دیکھ کر بتا دیتا کہ وہ کون ہے اور کہاں رہتی تھی۔“ حمید نے سادگی سے کہا۔

جگدیش ہنسنے لگا۔

”کیوں؟ کیا میں نے کوئی بیوقوفی کی بات کہہ دی۔“ حمید سنجیدگی سے بولا۔

جگدیش کی ہنسی تیز ہو گئی۔

”شاید تم بھی گئے۔“ حمید مایوسی سے بولا۔

جگدیش ہنستا رہا۔

”ارے....!“ دفعتاً حمید اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

”کیا....؟“ جگدیش نے بھی اس کی تقلید کی۔ حمید تاریک راہداری کی طرف دیکھ رہا تھا۔

جگدیش کے ساتھ تین کانسیبل بھی کھڑے ہو گئے تھے۔

”وہی عورت۔“ حمید نے سرگوشی کی۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی ہوئی تھیں۔

”کون عورت....!“ جگدیش نے پوچھا۔

”وہی.... جس کی لاش۔“

”کیا؟“ جگدیش سہمی ہوئی آواز میں بولا۔

حمید نے چھپ کر جگدیش کے ہولسٹر سے ریوالور نکال لیا اور راہداری کی طرف دوڑا۔

”ٹھہرو.... ٹھہرو۔“ جگدیش نے اُسے آواز دی۔ لیکن وہ جا چکا تھا۔ جگدیش وغیرہ راہداری کے سرے پر آکر کھڑے ہو گئے لیکن اُن میں سے کوئی بھی آگے بڑھنے کی ہمت نہیں کر رہا تھا۔

پھر انہوں نے ایسی آوازیں سنیں، جو عموماً دھینگا شستی کی صورت میں پیدا ہوتی ہیں۔ ساتھ ہی حمید کی کھٹی کھٹی سی آواز بھی سنائی دی۔ وہ جگدیش کو پکار رہا تھا۔

”کون ہے.... خبردار“ جگدیش نے لکار کر زمین پر پیر پٹنے لیکن اپنی جگہ سے ہلا نہیں۔ پھر اس نے پلٹ کر کانسیبلوں کی طرف دیکھا۔ لاش والے کمرے میں کوئی دھت سے زمین پر گرالور

ساتھ ہی کسی کے دوڑنے کی آواز آئی اور پھر سناٹا چھا گیا۔

جلدیش نے حمید کو آوازیں دیں لیکن جواب نہ ارد۔ اس نے رانو کے ہاتھ سے ٹارچ لے کر اور آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔

کمرے میں پہنچ کر انہوں نے عجیب منظر دیکھا۔ حمید زمین پر او نہ ہا پڑا اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اس کے ہاتھوں میں اتنی طاقت بھی نہ رہ گئی کہ وہ اُن پر زور دے اٹھ سکے۔ جلدیش نے جلدی سے جھک کر اُسے اٹھایا لیکن وہ اُس سے لپٹ پڑا۔

”ارے... ارے میں ہوں۔“ جلدیش بوکھلا کر بولا۔ لیکن حمید اس کی گردن میں ہاتھ دھجھکا دے چکا تھا۔ اگر سپاہی آگے بڑھ کر اُسے سنبھال نہ لیتے تو وہ سر کے بل زمین پر چلا آیا ہوتا۔ ”ہوش میں آؤ... میں جلدیش ہوں۔“ جلدیش خوفزدہ آوازیں میں چیخا۔

حمید گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا اور اس نے اس طرح اپنے سر کو جھٹکے دینے شروع کر دیئے پڑے بیہوشی کے اثرات سے پیچھا چھڑانا چاہتا ہو۔

”جلدیش...!“ وہ کھٹی ہوئی آواز میں بولا۔ ”تم کہاں مر گئے تھے وہ دو تھے۔“

”کون؟“

”پتہ نہیں۔“ حمید جلدیش کے ہاتھ سے ٹارچ لے کر چاروں طرف دیکھتا ہوا بولا۔

”... وہ تمہارا ریاوور لے گئے۔“

”کیا...؟“ جلدیش تقریباً چیخ پڑا۔

”دیکھتے کیا ہو! آگے بڑھو...“ حمید بوکھلا کر بولا اور نقب کے راستے باہر نکل گیا۔ جلدیش

وغیرہ بھی اس کے پیچھے لپکے۔

دوسری طرف تاریکی اور سناٹے کی حکومت تھی۔ حمید بدحواسی میں ادھر ادھر بھاگتا پھر تھا۔ جلدیش اور اس کے ساتھی بھی اُس کا ساتھ دے رہے تھے وہ رکتا تو رک جاتے بھاگتا تو کے پیچھے دوڑتے۔

”اب کہیں وہ بھی ہاتھ سے نہ جائے۔“ حمید نے چیخ کر کہا اور نقب کے راستے پھر کو ٹھہر

داخل ہو گیا۔ پرویز بدستور آرام کر سی پڑا تھا۔

”حمید صاحب۔“ جلدیش ہانپتا ہوا بولا۔ ”بہت بُرا ہوا... میرا ریاوور... اب کیا ہوگا۔“

”میں کیا جانوں۔“ حمید بھٹکا کر بولا۔ ”سراسر تمہاری غلطی ہے۔ اگر تم لوگ بھی میری مدد

کے لئے پہنچ گئے ہوتے تو کبھی ایسا نہ ہوتا۔“

جلدیش بدحواس ہو کر ایک کرسی پر گر گیا۔

”ملازمت گئی۔“ وہ بڑبڑایا۔ ”معطل ہو جاؤں گا۔ مقدمہ چلے گا۔“

”اگر انہوں نے مجھے ماری ڈالا ہوتا تو۔“ حمید غصہ سے بولا۔

”تم نے میرا ریاوور کیوں نکالا تھا۔“ جلدیش چیخا۔

”میں نے نہیں نکالا تھا۔“ حمید نے گردن جھٹک کر لاپرواہی سے کہا۔

”مت بکو۔“ جلدیش نے جھلاہٹ میں گھونسا تان کر کہا۔

”کیا بات ہے۔“ فریدی کی آواز سنائی دی۔ وہ دروازے میں کھڑا حمید اور جلدیش کو حیرت

دیکھ رہا تھا۔

”میرا بیڑا غرق کر دیا انہوں نے۔“ جلدیش فریدی کی طرف مڑا۔

”کیا بات ہے۔“ فریدی نے حمید سے پوچھا۔

”پتہ نہیں۔“ حمید گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”ایک بیک بیٹھے بیٹھے نہ جانے کیا ہو گیا۔“

”اتنا تو میں نے دیکھا تھا کہ ذرا سا اوگھ گئے تھے۔“

”مت بکو۔“ جلدیش حلق کے بل چیخا اور پھر اچانک اس کے چہرے پر بے بسی چھا گئی۔

”آخر بتاتے کیوں نہیں۔“ فریدی گڑگڑا کر بولا۔

جلدیش نے غصیلی اور روہانی آواز میں پورا واقعہ دہرایا۔

”تم بھگ تو نہیں پی گئے۔“ حمید بُرا مان کر بولا۔ ”یہ سالا سچ بھوت خانہ معلوم ہوتا ہے۔“

”کیا بات ہے۔“ فریدی حمید کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا اوپری ہونٹ بھیج کر بولا۔ ”ارے

آپ کا دماغ بھی پھر گیا۔“ حمید بے بسی سے بولا۔ ”کان دیکھئے کوئے پر غصہ اتارنے سے کیا فائدہ۔“

”دیکھو میں بہت بُری طرح پیش آؤں گا۔“

”تو آپ اچھی طرح کب پیش آتے ہیں۔“

”حمید...!“

”سرکار والا! ابھی اور اسی وقت میرا استعفیٰ منظور فرمائیے۔“

دفتا فریدی جگدیش کے ریوالور ہو لستر کی طرف دیکھنے لگا۔

”جگدیش کیا تم واقعی ہوش میں نہیں ہو۔“ فریدی اُسے گھور کر بولا۔

”جی.....!“ جگدیش گھبرا کر اُس کی طرف دیکھنے لگا۔

”کیا ریوالور تمہارے ہو لستر میں موجود نہیں ہے؟“

جگدیش نے بے اختیارانہ انداز میں ہو لستر میں ہاتھ ڈالا اور پھر ”ارے“ کہہ کر اچھ

پڑا..... ریوالور موجود تھا۔

”اُلو کی دم فاختہ۔“ حمید نے دانت پین کر جگدیش کو گھورتے ہوئے کہا۔

جگدیش کا حلیہ دیکھنے کے قابل تھا۔

”ایٹور قسم ان لوگوں سے پوچھ لیجئے۔“ جگدیش بوکھلا کر بولا۔ کانشیلوں اور پرویز

نو کروں نے حیرت آمیز انداز میں بڑبڑانا شروع کر دیا۔

فریدی حمید کی طرف مڑا لیکن وہ اتنی دیر میں راہداری کے بیرونی سرے تک پہنچ چکا

اُس نے تیز تیز قدموں سے پائیں باغ طے کیا اور پھانک سے گزرا کر سڑک پر آگیا اور پھر اُس

ایک طرف کھڑے ہو کر جو ہنسنا شروع کیا ہے تو پیٹ دباتے دباتے اس کا بڑا حال ہو گیا۔

اُس نے اس وقت جگدیش کے ساتھ وہ شرارت کی تھی کہ جگدیش شاید مرتے دم

اُسے نہ بھلا سکے۔ حقیقتاً اُسے کچھ بھی نہیں دکھائی دیا تھا اور نہ اس وقت اُس کے ذہن میں

شرارت تھی۔ اس نے محض جگدیش کو ڈرانے کے لئے مردہ عورت کے بھوت کا حوالہ دے

اُس کا ریوالور چھینا تھا لیکن جب اس نے یہ محسوس کیا کہ جگدیش اور اُس کے ساتھی خوف کی

سے کمرے تک آنے کی بھی ہمت نہیں کر رہے ہیں تو دفتا اس کے ذہن نے فلا بازی کھائی اور

نئی شرارت اس کے رگ وریشے میں کھلانے لگی۔ پھر اس نے خود ہی ایسی اچھل کود مچائی جیسے

کئی آدمیوں سے لڑ رہا ہو۔ بھاگنے اور گرنے والوں کی ایکٹنگ بھی خود ہی کی.... اور پھر جگد

اسے اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا تو اس نے چپ چاپ ریوالور اُس کے ہو لستر میں سرکا دیا تھا۔

اول تو خالی پیٹ میں ہنسی شاذ و نادر ہی آتی ہے لیکن اگر زیادہ دیر تک آتی تو پھر ریاح

گولے اس بُری طرح آنتوں میں ٹھوکر مارتے ہیں کہ خدا کی پناہ۔ لہذا حمید کے معدے پر

مصرعہ صادق آ رہا تھا۔ ”رہتے رہتے دل میں تیرا درد بھی ہو گیا۔“ پیٹ میں معدے کی جگہ

بہت بڑا دکھتا ہوا گولا محسوس ہو رہا تھا۔

وہ شہر کی طرف چل پڑا۔ بھوک کے مارے بُرا حال تھا۔ یہاں کسی سواری کا دستیاب ہونا

بھی مشکل ہی نظر آ رہا تھا۔ کبھی کبھی ایک آدھ کار گزر جاتی تھی۔ وہ ٹیکسی نہ ہوتی تھی۔ بہر حال وہ

پیدل ہی چلنے کا تہیہ کر کے سڑک چھوڑ کر عمارتوں کے پشت والے دیران حصے میں آگیا۔ سڑک

سے جانے میں زیادہ وقت صرف ہوتا اور چلنا بھی بہت پڑتا۔

حمید چلا تو آیا تھا لیکن حقیقتاً اُس کا ذہن اُسی قتل میں الجھا ہوا تھا۔ پرویز اس کمرے میں روزانہ

کسی عورت کو چیختے پر مجبور کرتا تھا۔ اگر وہ مقتولہ ہی تھی تو اتنے دنوں تک کمرے میں بند کیونکر

رہی دن میں اس نے شور کیوں نہیں مچایا۔ پھر اُس نقب کا کیا مطلب تھا۔ وہ غیر ملکی آدمی اُس

بڑے صندوق میں کیا لایا تھا۔ دفتا حمید کو یاد آیا کہ فریدی نے اس بکس سے کوئی کاغذ نکال کر جیب

میں رکھا تھا۔ وہ چلتے چلتے رک گیا۔ کہیں قریب ہی سے پٹرول کی تیز بو آرہی تھی۔

پٹرول کی بو

حمید آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تاریکی میں گھور رہا تھا۔ دفتا اُسے اپنی بائیں جانب والے نشیب میں

تاریج کی روشنی دکھائی دی۔ تقریباً دو ڈھائی سو گز کے فاصلے پر جھاڑیوں کے قریب ایک آدمی نظر

آ رہا تھا جس کے ہاتھ میں تاریج تھی۔ تاریج کی روشنی میں حمید کو ایک دوسرا انسانی مجسمہ دکھائی دیا،

جو ایک سفید چادر میں لپٹا ہوا زمین پر پڑا تھا۔ قریب ہی پٹرول کا ٹین رکھا تھا۔ اُس آدمی نے ٹین

اٹھا کر چادر میں لپٹے ہوئے جسم پر پٹرول اینڈلٹنا شروع کیا۔ ہوا کے جھونکے پٹرول کی بو کو دور دور

تک پھیلارہے تھے۔

حمید نے کچھ سوچے سمجھے بغیر اسے لٹکارنا شروع کر دیا۔

”خبردار! گولی مار دوں گا۔“

اس آدمی کے ہاتھ سے تاریج گر گئی اور وہ ایک ہی جست میں جھاڑیاں پار کر کے نظروں سے

لو جھل ہو گیا۔ حمید اپنی پوری قوت سے دوڑ رہا تھا اس نے زمین پر پڑے ہوئے آدمی کے پاس سے

تاریج اٹھائی اور جھاڑیوں میں گھس گیا لیکن چندرہ میں منٹ سر مارنے کے باوجود بھی بھاگنے والے

کا نشان نہ ملا۔

تھک ہار کر وہ پھر اسی جگہ واپس آگیا۔ چادر میں لپٹا ہوا جسم اب بھی اسی حالت میں پڑا تو حمید نے اُس کے چہرے سے چادر اٹھائی اور چیخ کر دو تین قدم پیچھے ہٹ گیا۔ کیا یہ اسی عورت کی لاش نہیں تھی۔ وہ لاش جسے تھوڑی دیر قبل پولیس اٹھالے گئی تھی پھر یہ یہاں کیسے۔ کیا اس پُر اسرار آدمی نے اس پر اس لئے پٹرول نہیں چھڑکا تھا کہ اُسے دے؟ آخر وہ کون تھا اور اسے لاش کس طرح ملی۔

وہ پھر آگے بڑھا۔ مقتولہ کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ حمید پھر ٹھٹک گیا۔ اسے یاد آ رہا تھا اُس نے جو لاش کمرے میں دیکھی تھی اس کی آنکھیں بند تھیں۔ لیکن یہ کھلی ہوئی آنکھیں زندگی سے بھرپور معلوم ہو رہی تھیں۔ حمید نے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھ دیا جو دبا ہی چلا گیا۔ وہ پھر بوہ کر پیچھے ہٹ آیا؟ کیا اس کا سر پلپلا ہے۔ یعنی سر میں ہڈی ہی نہیں۔ خوف کی ایک ٹھنڈی سی لہر اس کے جسم میں دوڑ گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔

اس نے پھر جی کڑا کر کے اس کے پیر ٹٹولے لیکن وہاں بھی ہڈی نہ در۔ ایک خیال تیز سے اُس کے ذہن میں گونجا اور اس نے اس جسم سے لپٹی ہوئی چادر کھینچ کر ایک طرف ڈال دیا اور پھر اُسے یہ سمجھ لینے میں دشواری نہ ہوئی کہ وہ مجسمہ ربر کا تھا۔ لیکن یہ بھی کم حیرت انگیز دریافت نہ تھی۔ آخر اس کا کیا مطلب! ربر کا مجسمہ؟ جو ہو بہو مقتولہ کی نقل تھا۔

حمید تھوڑی دیر کھڑا کچھ سوچتا رہا پھر اُس نے اس مجسمے کو اٹھایا اور چل پڑا۔ مجسمہ زبا بھاری نہیں تھا۔ تھوڑی دور چل کر وہ پھر لوٹ پڑا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کہیں اس واقعے کا تعلق ہم اسی معاملے سے نہ ہو۔ لہذا پٹرول کے ٹین اور اُس چادر کو وہیں چھوڑ دینا مناسب معلوم ہوا تو لیکن اس سلسلے میں سب سے بڑی دشواری یہ تھی کہ وہ اُن سب چیزوں کو لاتا کس طرح۔ وہ منٹ تک سوچتا رہا پھر اس نے پٹرول کا ٹین اور چادر جھاڑیوں میں چھپا دی۔

وہ اسی وقت پریوز کے مکان پر جا کر فریدی کو بھی اس کی اطلاع دے سکتا تھا لیکن آپہ دوسری اسکیم کے تحت جو اُسے اسی وقت سوچھی تھی اس نے واپس جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اس نے اس مجسمے کو کاندھے پر اٹھایا اور چل پڑا۔ اُسے سب سے زیادہ فکر اس بات کی تھی تو کروں کی نظر اُس مجسمے پر نہ پڑنے پائے۔ آخر کار وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو ہی گیا۔ وہ سب

فریدی کے کمرے میں پہنچا اور مجسمے کو اس کے بستر پر ڈال کر چادر سے ڈھک دیا۔ اُس سے فراغت حاصل کر کے اُس نے کھانے کے لئے ہلچلانا شروع کر دیا۔ اور پھر شاید پہلا لقمہ بھی نہ اٹھایا تھا کہ فریدی اور جگدیش بھی آگئے۔

”آج تمہاری خیریت نہیں۔“ فریدی اُسے مکاد کھا کر بولا۔

”اطلاعا عرض ہے کہ میں بھی کسی سے کمزور نہیں۔“ حمید نے لاپرواہی سے کہا اور جلدی جلدی منہ چلانے لگا۔

”بیٹھو بھی جگدیش۔“ فریدی ڈانٹنگ ٹیبل کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ ”میں کپڑے بدل کر آتا ہوں بے تکلف شروع کر دو۔ میں بھی آکر شریک ہو جاؤں گا۔“

فریدی اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔

”اور سناؤ بھائی جگدیش بہت دنوں بعد ملاقات ہوئی۔“ حمید سنجیدگی سے بولا۔ ”کھاؤ تا یار بس شروع ہو جاؤ! فریدی صاحب ابھی شیو کریں گے۔“

”میں تم سے ناراض ہوں۔“ جگدیش نے گردن اٹھا کر کہا۔ ”تم نے میرا بڑا مضحکہ اڑایا۔ کانٹیلوں کے سامنے تمہیں ایسی حرکت نہ کرنی چاہئے تھی۔“

”خدا کی قسم! کسی دن بیچ بازار میں تمہاری بے عزتی کروں گا۔“ حمید بگڑ کر بولا۔

”اگر فرض کرو وہ حادثہ حقیقت پر مبنی ہو تا تو تم نے میری گردن ہی کٹا دی تھی۔“ جگدیش بغلیں جھانکنے لگا۔

”تمہارے محکمے میں لوٹریوں کے علاوہ آج تک کوئی اور دوسرا جانور نظر نہ آیا۔“ چوڑیاں پکین۔۔۔۔۔“

دفعۃ حمید کے منہ کا نوالہ باہر نکل پڑا اور اس کے منہ سے عجیب طرح کی آوازیں نکلنے لگیں۔

”اے۔۔۔۔۔ اے۔۔۔۔۔ اے۔۔۔۔۔ ایہہ۔۔۔۔۔“

اور اس لمبی سی ”ایہہ“ کے بعد وہ کرسی سے لڑھک کر زمین پر چلا آیا۔

جگدیش نے پلٹ کر دیکھا۔ فریدی اُسی مجسمے کو گردن سے پکڑے ہوئے آ رہا تھا۔ حمید کو اس طرح گرتے دیکھ کر اُس نے اُسے زمین پر ڈال دیا اور حمید کی طرف لپکا۔

جگدیش حمید کی بجائے زمین پر پڑے ہوئے مجسمے کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”سنو بھی۔“ فریدی نے اُسے اپنی طرف متوجہ کر کے کہا۔ ”کیا تم بھی ڈر رہے ہو۔“
 ربر کا مجسمہ ہے۔ میاں حمید بیہوش ہو گئے ہیں۔“

فریدی کے ہونٹوں پر شرارت آمیز مسکراہٹ تھی۔ جلد لیش بھی اس کے قریب آئی۔
 فریدی چند لمحے حمید پر جھکار ہاتھ لے کر آمیز لہجے میں بڑبڑاتا رہا۔ پھر اس نے اس کے دونوں ہاتھ
 پکڑ کر جو زور لگایا ہے تو وہ ”اکھڑ گئے“ کا نعرہ مار کر کھڑا ہو گیا۔

”کہاں تھا یہ مجسمہ....؟“ فریدی نے دونوں ہاتھوں سے اس کی گردن دبوچ کر پوچھا۔
 ”ارے میں.... نہیں.... نہیں.... میں کیا جانوں۔“

حمید اس کے ہاتھ جھٹک کر پیچھے ہٹ گیا۔
 ”اس سے کام نہیں چلے گا بر خور دار....!“ فریدی مسکرا کر بولا۔ ”شرارت کے نشے میں
 اپنا رومال اسی کے نیچے چھوڑ آئے تھے۔“

”تب تو مجبوری ہے۔“ حمید اپنے کان سہلاتا ہوا بولا۔
 ”فضول باتیں مت کرو۔“

”میرے ایک دوست نے تحفہ پیش کیا ہے۔“ حمید منہ چلاتا ہوا بولا۔

”تین دن تک سونے نہیں دوں گا۔“ فریدی نے اُس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔
 حمید نے درویشوں کی طرح ہاتھ اٹھا کر شعر پڑھا۔

”قبر میں جی بھر کے سونا زندگی کی نیند کیا
 زہر دہاں عدم اٹھ اب سویرا ہو گیا“

”سچ کہتا ہوں! مارتے مارتے سویرا کر دوں گا۔“ فریدی بولا۔

”راستے میں پڑی ملی تھی۔“ حمید نے لاپرواہی سے کہا۔

”غلط کہتے ہو.... میرا خیال ہے کوئی اسے جلانے جا رہا تھا۔“

”جی....!“ حمید نوالا ہاتھ سے رکھ کر بولا.... اُسے حیرت ہو رہی تھی کہ فریدی اس پر
 کیونکر پہنچا۔ پٹرول کی بو بھی اُس میں باقی نہیں رہ گئی تھی۔

”جناب۔“ فریدی ہر سکون آواز میں بولا۔ ”مذاق میں مت ٹالو.... یہ بہت ضروری ہے
 حمید نے رک رک کر پورا واقعہ دہرایا۔ لیکن اُس کا ہاتھ اور منہ تیزی سے چل رہے۔“

اسے خدشہ تھا کہ فریدی واقعات سن لینے کے بعد جائے واردات کی طرف ضرور دوڑے گا۔ لہذا
 پیٹ تو بھری لیا جائے۔

”اور تم وہ چادر اور پٹرول کا ٹین و ہیں۔ چھوڑ آئے۔“ فریدی برا سامنہ بنا کر بولا۔

”بہت احتیاط سے ایک جگہ چھپا آیا ہوں۔“

”اچھا تو ختم کرو کھانا۔“

”ختم سرکار۔“ حمید نے پانی کا گلاس چڑھا کر ڈکالی اور پیٹ پر ہاتھ پھیرتا ہوا بولا۔ ”آپ

لوگ بھی کھالیجے۔“

”واپسی پر۔“ فریدی جلد لیش کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔

”جی ہاں.... اور کیا؟“ جلد لیش نے اٹھتے ہوئے کہا۔

فریدی نے گیرج سے جیب نکالی۔

”چلو تمہیں ڈرائیو کرو۔“ فریدی نے حمید سے کہا۔

”بہت بہتر۔“ حمید نے کہا۔ لیکن فریدی اس کی آنکھوں کی شرارت آمیز چمک نہ دیکھ سکا۔

سڑک سے گذر کر جیب ویران راستوں پر ہوئی۔ حمید جان بوجھ کر اُسے بہت زیادہ ناہموار
 زمین پر چلا رہا تھا۔

”یار بس بھی کرو۔“ جلد لیش کراہ کر بولا۔ ذرا ہی سی دیر میں جیب کے جھٹکوں نے اس کی نس

نس ڈھیلی کر دی تھی۔ فریدی خاموش بیٹھا رہا۔ پتہ نہیں وہ حمید کی اس حرکت کو جان بوجھ کر نظر

انداز کر رہا تھا یا خیالات میں اس بُری طرح کھویا ہوا تھا کہ اس کی طرف دھیان ہی نہیں ہوا۔

”کیوں....؟“ حمید نے فریدی کو مخاطب کیا۔ ”آپ نے اس کا اندازہ کیسے لگایا کہ کوئی اسے

جلانے جا رہا تھا۔“

”تم اسی لئے پوچھ رہے ہو نا کہ پٹرول کی بوتل تو اڑ گئی تھی؟“ فریدی نے پوچھا۔

”قطعی!“

”لیکن کانوں کے سوراخوں میں خفیف سی بو باقی رہ گئی تھی اور پھر اس کے بالوں میں ایک دیا

سلائی بھی ابجھی ہوئی ملی تھی۔ بہر حال تم چوک گئے۔ اس آدمی کو پکڑنا تھا۔“

”پوڈیر کا کیا ہوا؟“

”ہم اسے ہسپتال بھجوا کر آئے ہیں، اس کی نیند میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔“

اچانک حمید نے بریک لگائی اور جلد لیش کا سر اس کی پیٹھ سے ٹکرا گیا۔

”سنجھ کر بیٹھو۔“ حمید نے انجن بند کرتے ہوئے کہا اور نیچے اتر گیا۔

پٹرول کا ٹین اور چادر بدستور اُسی جگہ موجود تھے جہاں حمید نے انہیں چھپایا تھا۔

پھر وہ انہیں اُس مقام پر لایا جہاں یہ واقعہ پیش آیا تھا۔ فریدی ٹارچ کی روشنی میں قرب

جوار کی زمین کا جائزہ لینے لگا۔ ایک جگہ تین چار دیاسلائیاں پڑی ہوئی ملیں۔

”غالباً گھبراہٹ میں گر گئی ہوں گی۔“ فریدی بولا۔ ”آدمی بہت زیادہ دلیر نہیں معلوم

ہوتا۔“

زمین سخت تھی اس لئے قدموں کے نشانات دیکھنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ پھر، مرچنٹس کارپوریشن۔“ چھپا ہوا تھا۔

فریدی نے اس کے امکانات کو نظر انداز نہیں کیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ واپس لوٹ رہے تھے۔

”پرویز کے نوکروں کا کیا ہوا۔“ حمید نے پوچھا۔

”کچھ نہیں! ان کا کیا ہوتا۔“

”بہر حال بڑا پیچیدہ معاملہ ہے۔“ حمید نے کہا۔

”اب نہیں رہ گیا۔“ فریدی بولا۔ ”تھوڑی دیر قبل ضرور تھا۔“

”میں نہیں سمجھا۔“

”میں تم سے کب کہتا ہوں کہ سمجھو۔“ فریدی نے لاپرواہی سے کہا اور کچھ سوچنے لگا۔

پھر بقیہ راستہ خاموشی ہی سے طے ہوا۔

گھر پہنچ کر فریدی اور جلد لیش نے کھانا کھایا۔ دورانِ طعام میں جلد لیش نے اس کیس

متعلق کئی بار گفتگو کرنی چاہی لیکن فریدی نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ وہ خود بھی ابھی معاملات

نوعیت کو بخوبی نہیں سمجھ پایا ہے۔

جلد لیش کے چلے جانے کے بعد فریدی نے خود ہی گفتگو چھیڑ دی۔

”اگر یہ ربر کا نمونہ نہ ملتا تب بھی ہم اس نتیجے پر ضرور پہنچتے۔“

”کس نتیجے پر۔“ حمید نے پوچھا۔

”یہی کہ اس کمرے میں ایک ربر کا مجسمہ تھا۔“

”تو کیا وہ اُسی کمرے میں تھا۔“

”جواب۔“ فریدی سگار سلگاتا ہوا بولا۔ ”اُس بڑے صندوق میں وہ مجسمہ ہی لایا گیا تھا۔“

”کہاں سے؟“

”شہر کی ایک جاپانی فرم سے جو کھلونوں کا کاروبار کرتی ہے۔ غالباً پرویز نے باقاعدہ آرڈر

لے کر اسے بنوایا تھا اور میرا خیال ہے کہ اس پر کافی پیسہ صرف ہوا ہو گا۔“

”فرم کے متعلق آپ کو کیسے معلوم ہوا؟“ حمید نے پوچھا۔

فریدی نے جیب سے کاغذ کا ایک ٹکڑا نکال کر حمید کے سامنے رکھ دیا۔ اس پر ”جاپانیز

فرم“ لکھا ہوا تھا۔

”یہ پرچہ اُسی صندوق میں ملا تھا۔“ فریدی بولا۔

”بات کچھ کچھ سمجھ میں آتی ہے۔“ حمید نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”لیکن یہ بھی فی الحال

ٹپاس ہی ہے۔“

”چلو قیاس ہی سہی! لیکن یہ بت تو ممانی ہی پڑے گی کہ ابھی تم اسی مجسمے کی شکل کی ایک لاش

دیکھ چکے ہو۔ اور وہ بھی پرویز کی کوشی کے ایک پراسرار کمرے میں۔“

”چلے مان لی میں نے یہ بات.... پھر....؟“

”پھر یہ کہ پرویز کے عجیب و غریب عادات و اطوار۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔

”اچھا صاحب زادے تم نے اُس چھوٹے اور سیاہ رنگ کے صندوق کو بھی دیکھا ہو گا۔ جو ایک

چھوٹی سی میز پر رکھا ہوا تھا۔“

”کچھ یاد تو پڑتا ہے۔“

”اُسے بھی دیکھنے کی زحمت گوارا کی تھی تم نے۔“

”نہیں۔“

”اگر تم دیکھتے بھی تو اُس کی اہمیت کو نظر انداز کر جاتے۔“

”کیوں؟ کیا چیز تھی اس میں۔“

”کچھ بھی نہیں۔“ فریدی نے کہا۔ ”وہ حقیقتاً گراموفون تھا۔“

”گراموفون؟“ حمید نے احمقوں کی طرح دہرایا۔

”ہاں گراموفون؟.... کیا سمجھے؟“

”گراموفون ہی سمجھا؟“

”ڈیوٹ ہو! آخر اس کمرے میں گراموفون کا کیا کام؟ اور وہ بھی صرف گراموفون۔“

نثار دے پورے گھر میں ایک بھی ریکارڈ نہ مل سکا۔

”تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔“ حمید نے کہا۔ ”میرے خیال سے وہ ایک فالتو

ہونے کی بناء پر اس کمرے میں ڈال دیا گیا ہوگا۔ وہ کمرہ غالباً اسٹور روم کی حیثیت سے استعمال

جاتا ہے۔ کیونکہ نہ تو اس میں الیکٹرک فٹنگ ہے اور نہ کھڑکیاں وغیرہ۔“

”ٹھیک ہے! لیکن گراموفون کی ان استعمال شدہ سویچوں کے بارے میں کیا کہو گے جو

میز پر پائی گئی ہیں۔“

”تو کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ وہ چینی۔“

”بہت دیر میں سمجھے۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔ ”پرویز روز رات کو ایسا ریکارڈ بجاتا تھا جس:

صرف چینی تھیں۔“

”لیکن وہ ریکارڈ۔“

”اس مجھے کی طرح وہ بھی گراموفون سے غائب کر دیا گیا۔“

”فریدی خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگا اور پھر حمید لاکھ کوششوں کے باوجود بھی اُسے

پر آمادہ نہ کر سکا۔“

وہ کون تھی

دوسری صبح فریدی نے سب سے پہلے اسپتال فون کیا۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ پرویز کی نیند بد

جاری ہے اور یقین کے ساتھ یہ بتانا دشوار ہے کہ اس کا سلسلہ کب ختم ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ

کے لئے سر کے آپریشن کی ضرورت بھی پیش آئے۔

فریدی ریسپوررکھ کر کسی سوچ میں ڈوب گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اُس نے سر اٹھا کر حمید

کمرے کی طرف دیکھا۔ حمید ابھی تک خراٹے لے رہا تھا۔ فریدی نے ہینڈل گھما کر دروازہ کھولا

اس کی ہدایت تھی کہ سوتے وقت کمرے کو کبھی مقفل نہ کیا جائے۔

”حمید.....!“ فریدی نے آواز دی۔

”ارے..... ہر..... ہر..... ہٹ..... ٹخ..... ٹخ.....“ حمید نے بڑا کر کر وٹ لی۔

اور پھر فریدی نے جھنجھوڑ کر اُسے کھڑا کر دیا۔

”یہا مصیبت ہے؟“ حمید حلق پھاڑ کر چیخا۔

”خیر مجھے کیا۔ میں کہے دیتا ہوں کہ حمید صاحب نہیں ملنا چاہتے۔“ فریدی لا پرواہی سے بولا۔

”کس سے.....!“ حمید نے نرم لہجے میں پوچھا۔

”ایک لڑکی ڈرانگ روم میں تمہارا انتظار کر رہی ہے۔“

”لڑکی.....!“ حمید نے حیرت سے کہا پھر ہنس پڑا۔ ”مجھے گھس رہے ہیں، بہت اچھے۔“

”تمہاری مرضی۔“ فریدی شانوں کو جنبش دے کر جانے کے لئے مڑا۔

”ٹھہریے۔ آپ نے میرے بڑے حسین خواب کا خون کر دیا ہے۔ میں خواب دیکھ رہا تھا

مجھے میں مولیٰ خانے کا نشی بنا دیا گیا ہوں۔“

”تھے تو اسی قابل۔“ فریدی خشک لہجے میں بولا۔

اور پھر حمید کو یقین کر لینا پڑا کہ حقیقتاً کوئی لڑکی ڈرانگ روم میں اس کا انتظار کر رہی ہے۔

اس نے جلدی جلدی شیو کیا اور لباس تبدیل کر کے باہر نکلا تو فریدی کو ناشتے کی میز پر دیکھا جو

نہایت اطمینان سے بیٹھا کافی کی چسکیاں لے رہا تھا۔

حمید کو پھر خیال آیا کہ شاید اُس نے اُسے آلو بتایا ہے۔ لہذا وہ ڈرانگ روم کی طرف جانے کی

بجائے سیدھ ناشتے کی میز کی طرف بڑھا۔

”آج موسم خوشگوار ہے۔“ اُس نے اپنے سامنے کی پلیٹ سیدھی کرتے ہوئے کہا۔

”کل بھی خوشگوار تھا۔“ فریدی بولا۔

”امید ہے کہ پرسوں بھی رہے گا۔“ حمید نے کہا اور کافی اٹھیلنے لگا۔

”تو کیا تمہیں معلوم ہے کہ وہ چلی گئی۔“ فریدی چونک کر بولا۔

”مجھے اسی وقت سے معلوم ہے جس وقت آپ نے اس کی آمد کی خوشخبری سنائی تھی۔“ حمید

لا پرواہی سے بولا۔

”تم شاید مذاق سمجھے ہو۔“ فریدی نے سنجیدگی سے کہا۔ ”یہ لو۔“

اس نے اس کی طرف کاغذ کا ایک ٹکڑا بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”اپنا پتہ دے گئی ہے اور کہہ ہے کہ جلدی کی وجہ سے وہ انتظار نہیں کر سکتی۔ حمید صاحب کو بھیج دیجئے گا۔۔۔ تم اُسے کب جانتے ہو۔“

حمید نے تحریر پر نظر ڈالی، لیکن مس رعنا سلیم کی شخصیت اس کے ذہن کے گوشے میں ابھری۔ سرسری جان پہچان والیوں میں بھی شاید اس نام کی کوئی نہیں تھی۔

پتہ چار بٹا سولہ۔ دارو والا بلڈنگ تھا۔ اُسے یہ بھی یاد نہیں آ رہا تھا کہ اس نے کبھی عمارت ہی میں قدم رکھا ہو۔

”میں نہیں جانتا کہ یہ کون ہے؟“ حمید کاغذ پر نظر جمائے ہوئے آہستہ سے بولا۔

”جکتے ہو۔“ فریدی نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔

”آپ کو یقین نہ آئے گا۔“ حمید سنجیدگی سے بولا۔ ”لڑکی فراڈ معلوم ہوتی ہے، خیرہ دیکھوں گا۔“

فریدی کچھ نہ بولا۔ حمید تھوڑی دیر تک انتظار کرتا رہا کہ شاید کچھ کہے لیکن اس کی مسئلہ خاموشی نے خود اُسے ہی بولنے پر مجبور کر دیا۔

”آج کا پروگرام۔“

”کوئی خاص نہیں۔“ فریدی نے بے دلی سے کہا۔

”کیا آپ اس کیس میں دلچسپی نہیں لے رہے ہیں۔“

”قطعاً لے رہا ہوں۔“

”پھر.....؟“

”پھر کیا؟ ابھی تک کسی خاص نتیجے پر نہیں پہنچا۔“

”اگر میری موجودگی ضروری نہ ہو تو.....!“ حمید جملہ ختم کئے بغیر ہی خاموش ہو گیا۔

”میں جانتا ہوں کہ وہ تمہاری پرانی شناسا ہے اور تم اُس سے ملنے کے لئے ضرور جاؤ۔“

بہر حال میں تمہیں روکتا نہیں۔“

”شکریہ.....!“ حمید نے سعادت مندانہ انداز میں کہا۔

تھوڑی دیر بعد حمید کی موٹر سائیکل دارو والا بلڈنگ کی طرف جا رہی تھی۔ دارو والا بلڈنگ شہر کی مشہور عمارتوں میں سے تھی۔ اس کی شہرت کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اس کی تیسری منزل پر محکمہ خوراک کے دفاتر تھے۔ پہلی دوسری اور چوتھی منزلوں کے فلیٹ رہائش کے لئے استعمال ہوتے تھے اور ان کا کرایہ اتنا زیادہ تھا کہ صرف ذی حیثیت لوگ ہی اُن میں رہ سکتے تھے۔

حمید چوتھی منزل پر پہنچ کر سولہ نمبر کے فلیٹ کے سامنے رک گیا، جو مقفل تھا۔ دروازے کی داہنی جانب مس رعنا سلیم کے نام کی حتمی نظر آئی اس کا رہا سہا شبہ بھی رفع ہو گیا۔ ورنہ راستہ بھر وہ سوچتا آ رہا تھا کہ کہیں احقر نہ بننا پڑے۔ وہ فریدی کے مزاج سے اچھی طرح واقف تھا۔ جب بھی حمید اُسے چوٹ دینے کی کوشش کرتا اس کی طرف سے جوابی کارروائی ضرور ہوتی۔ پچھلی رات اُس نے اُسے اُس مجسمے کے سلسلے میں بیوقوف بنانے کی کوشش کی تھی لہذا اُسے خدشہ تھا کہ فریدی اُس کا بدلہ ضرور لے گا۔

حمید کھڑا سوچ رہا تھا کہ برابر والے فلیٹ سے ایک لڑکی نکلی اور حمید کو وہاں کھڑے دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ حمید نے پہلی ہی نظر میں اس کا پورا جائزہ لے لیا تھا۔ وہ ایک قبول صورت اور الٹرا موزن قسم کی لڑکی تھی۔ عمر اٹھارہ انیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ نیلے اسکرٹ میں وہ کافی حسین لگ رہی تھی۔

حمید نے اپنی فلت ہیٹ اتاری اور مودبانہ انداز میں بولا۔

”کیا آپ مس رعنا سلیم کے متعلق کچھ بتا سکیں گی۔“

لڑکی نے تجر آمیز نظروں سے اُسے دیکھا اور پھر خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

”آپ ٹھہریے۔ میں انہیں بلائے دیتی ہوں۔ غالباً غلطی منزل میں ہوں گی۔“

حمید اُس کا انتظار کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ایک گراڈیل قسم کے اوپن آرمی کیسا تھ واپس آئی۔ پھر وہ تو اپنے فلیٹ میں چلی گئی اور وہ آدمی کھڑا حمید کو گھورتا رہا۔ اس نے خاکی گبرڈین کے چٹلون پر چوڑی دھاریوں والی بنیائیں پہن رکھی تھی۔ حمید نے یہ بھی محسوس کیا کہ وہ نشے میں ہے۔

”کیوں..... بیٹا؟“ وہ بھاری بھر کم آواز میں غرایا۔

”کیا مطلب.....!“ حمید کی بھنویں تن گئیں۔

واقعہ کیا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے انہیں چوٹ کھانے والے سے ذرہ برابر بھی ہمدردی نہ ہو۔
 ”سارے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ ڈھمپ کل۔“ وہ پھر اٹھ کر حمید کی طرف جھپٹا۔ لیکن اس
 بار حمید کی ٹانگ چل گئی اور اُسے خود ہی اعتراف کرنا پڑا کہ اس نے اس سے پہلے کبھی اتنی شاندار
 چپ اس (غالباً فارسی میں ”چپ راست“) نہیں ماری تھی۔ وہ پھر ڈھیر ہو گیا اور اس بار اس کا سر
 دیوار سے ٹکرا گیا۔ وہ بیہوش ہو گیا تھا۔

نیلے رنگ کے اسکرٹ والی لڑکی پھر نیچے کی طرف جانے لگی۔
 ”تھہرو۔“ حمید نے اُسے مخاطب کیا۔ ”ادھر چلو! تم نیچے نہیں جاسکتیں۔“
 ”کیوں؟“ وہ پلٹ کر حمید کو گھورنے لگی۔
 ”اپنے فلیٹ میں جاؤ۔“ حمید تھکمانہ لہجے میں بولا۔
 ”نہیں جاتی۔۔۔۔۔ تم کون ہو۔ میں ابھی پولیس کو اطلاع دیتی ہوں۔“
 ”میں پولیس کا باپ ہوں۔۔۔۔۔ اندر جاؤ۔“

لڑکی نے تماشائیوں کی طرف دیکھا لیکن ان میں سے کسی نے بھی اپنی جگہ سے جنبش تک نہ کی۔
 معاملات آہستہ آہستہ حمید کی سمجھ میں آتے جا رہے تھے۔
 ”لڑکی۔۔۔۔۔ مجھے سختی پر مجبور نہ کرو۔ میں تمہیں اچھی طرح پہچانتا ہوں اور یہ بھی جانتا ہوں
 کہ یہ شریف آدمی تمہاری طرف داری کیوں نہیں کر رہے ہیں۔ اندر جاؤ۔“
 بیہوش آدمی ابھی تک وہیں پڑا ہوا تھا کسی نے یہ بھی دیکھنے کی زحمت گوارا نہ کی کہ وہ زندہ
 ہے یا مر گیا۔ دفعتاً حمید نے آگے بڑھ کر اس لڑکی کا ہاتھ پکڑا اور اُسے اس کے فلیٹ میں دھکیل کر
 دروازہ باہر سے بند کر لیا۔

”آپ کون ہیں؟“ تماشائیوں میں سے ایک نے پوچھا۔
 ”سرکاری آدمی۔“ حمید آہستہ سے بولا۔ ”ذرا ادھر آئیے۔“
 حمید رعنا سلیم کے فلیٹ کی کھلی ہوئی کھڑکی کے سامنے کھڑا تھا۔ اُس آدمی کے قریب پہنچتے
 ہی اُس نے تصویر کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔
 ”وہ رعنا سلیم ہی ہے۔“

”جی ہاں!“ اس نے سر ہلا کر کہا اور حمید کی طرف حیرت سے دیکھنے لگا۔

”ڈھمپ کل! مطلب پوچھتے ہو۔“ اُس نے ہنس کر کہا۔ ”کہاں ہے لونڈیا؟“
 ”ہوش میں ہو یا نہیں۔“ حمید کو غصہ آ گیا۔

”لونڈیا کہاں ہے؟ مارتے مارتے ڈھمپ کل بنا دوں گا۔ بتاؤ لونڈیا کہاں ہے ڈھمپ کل۔“
 ”شٹ اپ!۔۔۔۔۔!“

”شٹ اپ سے کام نہیں چلے گا ڈھمپ کل۔ کل رات وہ تمہارے ہی ساتھ گئی؟“
 ڈھمپ کل اب رد اجماعے آئے ہو۔ بتاؤ ورنہ بھیجا چھاڑ دوں گا۔“

حمید چکر اگیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ برابر والے فلیٹ میں دستک دے یا اُسی
 الجھار ہے۔ اُسے ساتھ لانے والی اتنی بے تکلفی سے اپنے فلیٹ میں چلی گئی تھی جیسے تھوڑی
 قبل اُس سے اور حمید سے کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو۔

”میں رعنا سلیم کے متعلق پوچھ رہا تھا۔“ حمید نے نرمی سے کہا۔
 ”اور نہیں تو کیا میں اُس کی ماں کے بارے میں کہہ رہا ہوں ڈھمپ کل! بتاؤ لونڈیا کہاں ہے۔“
 ”ہوں۔“ حمید اوپری ہونٹ بھیج کر بولا۔ ”اور یہ ڈھمپ کل کیا ہے۔“
 ”ڈھمپ کل ہے۔ بتاؤ لونڈیا کہاں ہے۔“

اس بار حمید کی زبان نہیں چلی بلکہ ہاتھ چلا۔ وہ نشے میں تو تھا ہی۔ تھپڑ کا بار نہ سنبھال۔
 لڑکھڑایا تو پیٹھ کھڑکی سے جا لگی۔ کھڑکی شاندار اندر سے بند نہیں تھی۔ اس کے دونوں پٹ کھل۔
 اور توازن برقرار نہ رکھ سکے کی بناء پر اس کی کمر دوہری ہو گئی۔ اس کے منہ سے ایک کریہہ
 نکلی اور وہ دونوں ہاتھوں سے کمر تھام کر بیٹھ گیا۔ اس پر سے حمید نے ایک ٹھوکر بھی جڑی۔
 لیکن دوسرا لمحہ ایسا نہیں تھا کہ اُسے اس آدمی کی طرف دھیان دینے کا موقع ملتا وہ بیٹھا
 رہا تھا اور ارد گرد کے فلیٹوں سے لوگ نکلنے لگے تھے

حمید کی نظریں کھڑکی سے گزر کر کمرے کے اندر لگی ہوئی ایک بڑی تصویر پر جم گئیں او
 سو فیصدی اسی عورت کی تصویر تھی جس کی لاش وہ بچھلی رات کو پرویز کے یہاں دیکھ چکا تھا۔
 نے پھر ایک اچھتی ہی نظر ان لوگوں پر ڈالی جو فلیٹوں سے نکل کر بالکنی میں جمع ہو رہے تھے۔
 اسکرٹ والی لڑکی چوٹ کھائے ہوئے آدمی کو فرش سے اٹھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ حمید
 اس بات پر بڑی حیرت ہو رہی تھی کہ فلیٹ والوں نے یہ تک جاننے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی

”اس کا رونا سے کیا تعلق ہے۔“ حمید نے بیہوش آدمی کی طرف اشارہ کیا۔
 ”تعلق! کیا بتاؤں۔“ اس نے کہا۔ ”ان سب نے مل کر ہماری زندگی تلخ کر رکھی ہے
 ہی کیا آپ نے جو مارتھا کو نیچے نہیں جانے دیا ورنہ وہ اس کے ساتھیوں کو بلالاتی۔“
 ”ان دونوں کے علاوہ کوئی اور بھی لڑکی یہاں ایسی ہے۔“
 ”نہیں.... صرف یہی دونوں.... اور یہ ٹائیگر۔“ اس نے بیہوش آدمی کی طرف
 کر کے کہا۔ ”ایک خطرناک قسم کا غنڈہ ہے۔ ان دونوں سے پیشہ کرتا ہے۔“
 ”کیا اس کا نام ٹائیگر ہے؟“ حمید نے پوچھا۔
 ”نام کوئی نہیں جانتا۔ وہ خود کو فخریہ ٹائیگر کہتا ہے اور امریکی ڈاکوؤں کی طرح کا لباس پہنتا ہے
 ہوں.... یہاں کہیں قریب فون ہے۔“
 ”جی ہاں.... میرے فلیٹ میں۔“ تمنا شایوں میں سے ایک نے کہا۔ ”میرے ساتھ آئیے
 آپ لوگوں نے پولیس کو اس کی اطلاع کیوں نہیں دی۔“ حمید نے اس سے پوچھا۔
 ”اپنی شامت بلواتے یہ اور اس کے ساتھی ہمیں زندہ نہ رہنے دیتے۔ معاف کیجئے گا پو:
 خود اس سے پیسے کھاتی ہے۔“
 تھوڑی دیر بعد حمید انسپکٹر جگدیش کو فون کر رہا تھا۔
 ”ہیلو.... انسپکٹر جگدیش.... میں حمید بول رہا ہوں.... مقتولہ کی رہائش کا پتہ چل گیا،
 والا بلڈنگ کی چوتھی منزل پر فوراً پہنچو۔“
 حمید سوچ رہا تھا کہ آخر فریدی کو مقتولہ کا ٹھکانہ کیسے معلوم ہوا۔ اُسے اس کے نام کا
 کیونکر ہوا۔ یہ بات تو اس کی سمجھ میں اچھی طرح آگئی تھی کہ اس وقت فریدی نے دراصل
 سے پچھلی رات والی شرارتوں کا بدلہ لیا تھا۔
 ”اس غنڈے کے دوسرے ساتھی کہاں ہوں گے۔“ حمید نے ایک سے پوچھا۔
 ”نیچے پہلے مالے میں فرینڈز ہوٹل جو ہے نا۔ وہ اسی سالے کا ہے اور اس کے ساتھی
 ہوتے ہیں۔“
 دارو والا بلڈنگ سے کو توالی زیادہ دور نہیں تھی اس لئے جگدیش کو وہاں پہنچنے میں دیر نہ لگی
 ”فریدی صاحب کہاں ہیں۔“ جگدیش نے پوچھا۔

”پتہ نہیں۔“ حمید بولا۔ ”سب سے پہلے اُن غنڈوں کو پکڑنا ہے۔“
 فلیٹ والوں کی شناخت پر ٹائیگر اور اس کے ساتھیوں کو حراست میں لے لیا گیا۔ ٹائیگر کو
 ہوش آگیا تھا اور وہ بوکھلائی ہوئی نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ نیلے اسکرٹ والی مارتھا
 بھی حراست میں لے لی گئی۔ یہ بات تو ظاہر ہی ہو چکی تھی کہ وہ لوگ ان لڑکیوں سے پیشہ کرتے
 تھے لہذا حمید نے اُن سے رونا کے متعلق پوچھ پگچھ شروع کی۔
 ”تم نے یہ کیسے اندازہ لگایا تھا کہ کل رات کو رونا جس کے ساتھ تھی وہ میں ہی تھا۔“ حمید
 نے مارتھا کو مخاطب کیا۔
 ”میں نے اس کی شکل نہیں دیکھی تھی۔“ مارتھا نے آہستہ سے کہا۔ ”لیکن اس نے سوٹ
 اسی قسم کا پہن رکھا تھا۔“
 ”کیا وہ یہاں آیا تھا؟“
 ”نہیں۔“
 ”پھر تم نے انہیں کہاں دیکھا تھا۔“
 ”آر لکچو میں۔“
 ”تو تم نے اس کا چہرہ نہیں دیکھا۔“
 ”نہیں۔“
 ”یہاں اُس کے پاس کون کون آتا تھا۔“
 ”یہاں کوئی نہیں آتا۔“ مارتھا نے کہا اور سر جھکا لیا۔
 ”سو سائیکل گر لڑ والا رویہ ہو گا ان کا۔“ جگدیش مسکرا کر بولا۔
 ”کچھ ایسے آدمیوں کے متعلق بتا سکتی ہو جن کے ساتھ تم نے اُسے کبھی دیکھا ہو گا۔“
 ”یہ بتانا مشکل ہے۔ ہم دونوں کبھی ساتھ نہیں رہے۔“
 ”کیا تم جانتی ہو کہ کسی نے اُسے پچھلی رات کو قتل کر دیا؟“
 ”کیا....؟“ مارتھا چیخ اٹھی۔ اس کی آنکھیں خوف اور حیرت سے پھیل گئیں تھیں۔
 ”صاحب ہم بے قصور ہیں۔“ ٹائیگر ہاتھ جوڑ کر گڑگڑایا۔ اس کے چہرے پر بھی ہوائیاں
 اڑنے لگی تھیں۔

حمید رعنہ سلیم کے فلیٹ کی تلاشی لینے کے متعلق سوچنے لگا۔

ایک تصویر

واپسی پر حمید کا سینہ فخر سے پھولا ہوا تھا۔ پور ٹیکو میں قدم رکھتے ہی اُس نے انگریزی سرور میں سیٹی بجانی شروع کر دی۔ تلاشی کے دوران میں اس نے چند ایسی چیزیں دریافت کی تھیں جنہیں اس کی نظروں میں بڑی اہمیت تھی۔

نوکرؤں سے معلوم ہوا کہ فریدی تجربہ گاہ میں ہے۔ حمید بڑی شان سے زینے طے کرتا ہو اور پری منزل پر پہنچا۔ فریدی اسٹ ٹیوب میں کوئی سیال شے ڈالے ہوئے اسپرٹ لیمپ کی لوہ گردش دے رہا تھا۔ حمید کی آہٹ پر اس نے سر اٹھا کر دروازے کی طرف دیکھا اور پھر مشغول ہو گیا۔ حمید تھوڑی دیر تک خاموش کھڑا رہا لیکن جب فریدی اس کی طرف متوجہ نہ ہوا تو وہ خود ہی بولا۔

”رعنہ سلیم آپ کے حسن کی بڑی تعریف کر رہی تھی۔“

”میں جانتا ہوں کہ تم کوئی حماقت کر کے آئے ہو۔“ فریدی بدستور سر جھکائے ہوئے بولا۔

”جی ہاں! میں نے اُس سے آپ کی شادی طے کر دی ہے۔“

”شکریہ۔“ فریدی لا پرواہی سے بولا اور پھر اسٹ ٹیوب کو اسپرٹ لیمپ سے ہٹا کر آنکھوں کے قریب لے جاتا ہوا بڑبڑایا۔ ”یہ ذرات تحلیل نہیں ہو سکتے۔“

”خواہ میری کھوپڑی تحلیل ہو کر دریائے نرہدا ہو جائے۔“ حمید اپنا اوپری ہونٹ بھیج بولا۔

”کیا مضائقہ ہے؟ لیکن یہ ذرات۔“

”میں کہتا ہوں آخر اس طرح اُلو بنانے کی کیا ضرورت تھی۔“ حمید جھنجھلا کر بولا۔

”محض اس لئے کہ میں تمہیں انگلی پکڑ کر نہیں چلانا چاہتا۔“

”نہیں بلکہ گردن پکڑ کر دھکا دینا چاہتا ہوں۔“ حمید نے متناکر کہا۔

”سنو! اس کیس کو تمہیں ہی پتہ چلتا ہے۔ میں آج کل بہت مشغول ہوں۔“ فریدی نے کہا۔

اسٹ ٹیوب کی سیال شے ایک برتن میں اندیل دی۔ پھر اس نے رومال سے دونوں ہاتھ صاف

کر کے سگار سلگایا اور حمید کے چہرے پر نظریں جماتا ہوا بولا۔ ”بک چلو۔“

”بک بک بک۔“ حمید نے ٹہلنا شروع کر دیا اس حرکت میں جھنجھلاہٹ بھی شامل تھی۔

فریدی ہنس پڑا۔

”میں کہتا ہوں اگر میں پٹ جاتا تو۔“ حمید پلٹ پڑا۔

”آئندہ کے لئے سعادت مند ہو جاتے اور کیا۔“

حمید نے سوچا کہ زیادہ بات بڑھانا مناسب نہیں آخر اسے اپنی کارگزاریوں کی دھاک بھی تو بٹھانی تھی۔

”آپ کو اس کا نام اور پتہ کیسے معلوم ہوا تھا۔“ حمید نے پوچھا۔

”اس کے ملاقاتی کارڈ سے، جو اس کے پرس سے برآمد ہوا تھا۔“

”رات آپ نے اس کا تذکرہ نہیں کیا تھا۔“

”کیوں؟“

”یونہی....!“

”اس تصویر کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے۔“ حمید نے اپنی جیب سے ایک تصویر نکال کر فریدی کے سامنے ڈال دی۔ یہ اسی تلاشی کے دوران میں ملی تھی۔

”معاملہ بالکل صاف ہو گیا۔“ فریدی آہستہ سے بڑبڑایا۔

اس تصویر کے متعلق حمید نے بھی کچھ سوچا تھا لہذا وہ فریدی کی رائے معلوم کرنے کے لئے بے چین ہو گیا۔

”مادر یہ کہ وہ ایک پیشہ ور قسم کی سوسائٹی گرل تھی۔“ حمید نے کہا اور پوری روداد دہرا دی۔

فریدی خاموش ہو گیا۔ اس کا چہرہ صاف بتا رہا تھا کہ وہ بہت تیزی سے سوچ رہا تھا۔ دفعتاً وہ معنی خیز نظروں سے حمید کی طرف دیکھنے لگا۔

”اس نے اُن دونوں کو آر لکچو میں کس وقت دیکھا تھا؟“ فریدی نے پوچھا۔

”ساڑھے چھ اور سات کے درمیان۔“

”ٹھیک۔“ فریدی پھر سوچ میں پڑ گیا۔

حمید تھوڑی دیر تک خاموش رہا لیکن پھر فریدی کی خاموشی برداشت سے باہر ہو گئی۔

”ابھی آپ نے کہا تھا کہ معاملہ صاف ہو گیا۔“

”اؤں! فریدی نے چونک کر انگڑائی لی اور حمید کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگا۔

”معاملہ قطعی صاف ہو گیا۔ پرویز حقیقتاً وہاں اس عورت کی موجودگی سے لاعلم تھا اور

نے اسی ربر کے مجسمے کے دھوکے میں اس کی گردن دبا دی۔“

”کیا پرویز کو ہوش آگیا۔“ حمید نے پوچھا۔

”نہیں۔“

”پھر آپ کس طرح کہہ سکتے ہیں۔“

”اس سلسلے میں جتنے بھی واقعات پیش آئے ہیں انہیں یکجا کر کے ترتیب دے لو اور پھر پرویز

کی پچھلی زندگی اور اس کے عادات و اطوار کی روشنی میں ان کا جائزہ لو۔ بات سمجھ میں آجائے گی۔“

”مجھے ان لوگوں کے بیان پر شبہ ہے۔“ حمید بولا۔

”کیوں؟“

”مجھے وہ بھی اس سازش میں شریک معلوم ہوتے ہیں۔“

”کیا تم قتل کے مقصد سے واقف ہو۔“ فریدی نے پوچھا۔

”نہیں؟“

”پھر تم نے لفظ سازش کیسے استعمال کیا۔“

”میرا مطلب یہ ہے کہ وہ بھی پرویز سے ملے ہوئے ہیں۔“

”غلط سمجھو۔۔۔ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ سب یا ان میں سے کوئی اس آدمی سے تعلق رکھتا ہو۔“

”کی وجہ سے یہ حادثہ رونما ہوا۔“

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔“

”یہ قتل پرویز سے نادانستگی میں کرایا گیا ہے۔“

”کس طرح؟“

”جس طرح تمہاری کھوپڑی الٹ گئی ہے۔“ فریدی جھنجھلا کر بولا۔ ”میں جانتا ہوں کہ

وقت تمہارا ذہن اس عورت میں الجھا ہوا ہے جسے پولیس کے سپرد کر آئے ہو۔“

”اس سے میں بہت بڑے بڑے کام لینے کا ارادہ رکھتا ہوں۔“ حمید اکتا کر بولا۔

”بکومت۔“ فریدی تجربہ گاہ سے نکل کر نیچے چلا گیا۔ حمید نے منہ بنا کر اپنے شانے سکوڑے

اور وہ بھی اس کے پیچھے چل پڑا۔

فریدی ابھی زینوں ہی پر تھا کہ باہر کی گھنٹی بجی۔ شاید کوئی ملاقاتی تھا۔ وہ کچھ دیر صحن میں کھڑا

رہا لیکن جب کوئی کسی کا ملاقاتی کارڈ لے کر اندر نہ آیا تو وہ خود ہی ڈرائنگ روم کی طرف بڑھا۔

آنے والا شاید اسی کے محکمے سے تعلق رکھتا تھا ایسے لوگوں کے لئے ملاقاتی کارڈ کی رسمی قید نہیں

تھی۔ وہ عموماً گھنٹی استعمال کرنے کے بعد ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر اس کا انتظار کرتے تھے۔

حمید برآمدے ہی میں تھا کہ فریدی ڈرائنگ روم سے واپس آگیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک

کاغذ تھا۔

”کچھ نہیں۔۔۔۔۔ فضول۔۔۔۔۔ میں پہلے ہی سمجھا تھا۔“ وہ کاغذ پر نظریں جمائے ہوئے بڑبڑایا۔

”کیا۔۔۔۔۔!“

”فنگر پرنٹ والوں کی رپورٹ یہ ہے۔ پٹرول کے ٹین پر تمہاری انگلیوں کے نشانات کے علاوہ

اور کچھ نہیں ملا۔“

”اس نے دستاویز پہن رکھے ہوں گے؟“

”ہاں کافی ہو شیار آدمی معلوم ہوتا ہے۔“

”ہو گا۔۔۔۔۔ اس معاملے کو بھی تو صاف کیجئے نا۔“ حمید اکتا کر بولا۔

فریدی تھوڑی دیر تک اُسے گھورتا رہا پھر بولا۔

”پرویز نے اس عورت کی نقل کیوں تیار کرائی تھی۔“

”بد بختی تھی سالے کی۔“ حمید نے بھنا کر کہا۔

”اور چیخوں والا ریکارڈ کیوں بنوایا تھا۔“ فریدی روم میں بولتا رہا۔ ”اس کی شخصیت اتنی پر اسرار

کیوں تھی؟ وہ دنیا سے بے تعلق اس عمارت میں کیوں بند رہتا تھا؟ اس کے اندر اذیت پسندانہ

رجحانات کیوں پیدا ہوئے تھے؟“

حمید خاموش رہا۔

”اس نے دو ماہ قبل جاپانیز مرچنس کارپوریشن کے ذریعہ ایک ایسا مجسمہ تیار کرایا، جو ایک

عورت کی نقل تھا۔ ایک ایسا ریکارڈ تیار کرایا جس میں صرف چیخیں تھیں۔ کل رات اُسے اس

کمرے میں مجھے کی بجائے اُس عورت کی لاش ملی جس کی نقل وہ مجسمہ تھا۔ پھر تم نے کسی نامعلوم آدمی کو دیکھا، جو اس مجسمے کو جلانے کی کوشش کر رہا تھا اس کا مطلب یہ ہوا کہ کل رات اس مجسمے جگہ اس کی ہم شکل عورت نے لے لی تھی۔ آخر پرویز نے اُسے مار کیوں ڈالا؟ اور اعترافِ جرم کے ساتھ ہی ساتھ اپنی بے گناہی کیوں ثابت کرنا رہا۔“

۔۔۔ فریدی خاموش ہو کر حید کی طرف دیکھنے لگا پھر آہستہ سے بولا۔ ”مرچنٹس کارپوریشن نے منتظم نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ وہ مجسمہ خاص طور سے آرڈر دے کر بنوایا گیا تھا۔ اُس کے لئے پرویز نے اس عورت کی پوری تصویر دی تھی ساتھ ہی ریکارڈ کا آرڈر بھی۔“

”چلے میں سمجھ گیا کہ وہ مجسمہ بنوایا گیا تھا؟“ حید نے کہا۔ ”لیکن میں اس پر کیسے یقین کر لوں کہ پرویز نے اُسے نادانستگی میں مار ڈالا۔“

”اس کی بھی وجہ ہے تم اس کے علاوہ اور کچھ نہیں سمجھ سکتے۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔

۔۔۔ تم اس نقب کو کیوں بھول گئے۔ چلو خیر اسے بھی جانے دو۔ پرویز نے اگر اسے جان بوجھ کر مار ڈالا تھا تو اس نے اُس کی لاش کو ٹھکانے کیوں لگا دیا اس کے لئے کافی موقع تھا ظاہر ہے کہ اگر وہ رات بھر بھی اس کمرے میں بند رہتا تو کسی نوکر کی ہمت اس کے قریب آنے کی نہ پڑتی کیونکہ اُس کمرے ہی سے خائف تھے۔

”نہیں۔“ حید نے کہا۔ ”میں اُس نقب کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ اُس نقب ہی کی بناء پر کہ رہا ہوں کہ پرویز نے اُسے جان بوجھ کر قتل کیا تھا اور اسے ٹھکانے لگا دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُس نے اُسے مار ڈالنے کے بعد خود ہی نقب لگائی مگر نہیں۔۔۔ اگر یہ بات تھی تو وہ کمرے کے اندر کس طرح پہنچی تھی۔“

فریدی نے قہقہہ لگایا۔ ”بس بوکھلا گئے۔ چلو سنو! تمہارے پاس اس کا کوئی ثبوت نہیں۔ اُس نے اُسے جان بوجھ کر یا اپنے ہوش میں قتل کیا۔ ہو سکتا ہے کہ میری تھوہری غلط ہو لیکن نے امکانات ہی کی روشنی میں اُسے مرتب کیا ہے۔ میری دانست میں کسی شخص نے، جو پرویز اس کے معمولات سے اچھی طرح واقف تھا اس عورت کو نقب کے راستے کمرے میں پہنچایا اُسے وہیں ٹھہرنے کی تاکید کر کے وہ ریکارڈ اور مجسمہ وہاں سے نکال لے گیا اور ہو سکتا ہے کہ نے وہاں دیا سلائی اور موم بتی بھی غائب کر دی ہو۔ اس کے جانے کے بعد پرویز اندر داخل ہو

اور اندھیرے میں اس عورت کو مجسمہ ہی سمجھ کر اس کا گلا گھونٹنے لگا ہو۔“

”بھلا مجسمے کا گلا گھونٹنے سے کیا مراد؟“ حید نے اُسے ٹوکا۔

”تو کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ وہ گراموفون پر چیخوں کا ریکارڈ لگا کر اُس مجسمے کی پوجا کرنا رہا ہوگا۔ کیا تمہیں نوکروں کا بیان یاد نہیں۔ کیا پرویز کی ان حرکتوں کا علم نہیں جو وہ ننھے ننھے پرندوں گلہریوں اور تیلیوں کے ساتھ کیا کرتا تھا۔ کیا تم اس کا مطلب بتا سکتے ہو کہ وہ پرندوں کو چھوڑ کر صرف مادہ پرندوں ہی کو کیوں اذیت دیتا تھا۔۔۔۔۔ بہر حال“ وہ تھوڑی دیر رک کر پھر بولا۔ ”میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اگر وہ عورت اُسے روز روشن میں کہیں مل جاتی تو وہ اُسے زندہ نہ چھوڑتا۔“

”اس کا مطلب ہے کہ۔۔۔۔۔!“

”قطعاً! میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ اُس سے یہ قتل نادانستگی میں سرزد ہوا۔“

”آخر وہ کون ہو سکتی ہے۔“ حید بڑبڑایا۔

”عورت۔۔۔۔۔ عورت۔۔۔۔۔ عورت۔“ فریدی دانت پیس کر بولا۔

حید اُسے حیرت سے دیکھنے لگا۔

”یہ ایک ایسی ضرورت ہے جس سے پیچھا چھڑانا محال ہے؟ یہ صرف انہیں لمحات میں تم پر جان دیتی ہے جب تم نے اُس کے جذبات ابھار دیئے ہوں اور اس کے علاوہ وہ صرف ماں بن سکتی ہے، بہن بن سکتی ہے اور بیٹی بن کر وفادار رہ سکتی ہے۔“

”میں نہیں سمجھا؟“ حید بوکھلا کر بولا۔

”کچھ نہیں میں نے ایک غیر متعلق بات شروع کر دی تھی۔ ویسے مختصر آئیے کہ رعنا کبھی نہ کبھی پرویز کی بیوی ضرور رہی ہوگی۔“

”بیوی!“ حید تقریباً چیخ پڑا۔

”قیاس ہے۔ فی الحال میرے پاس اس کا واضح ثبوت نہیں۔“

”اگر وہ اس کی بیوی تھی تو میں بیویوں کے مستقبل سے مایوس ہوں۔“

”بیوی!“ فریدی بد خیال انداز میں بڑبڑایا۔ ”شٹ اپ۔۔۔۔۔ اس لفظ کو بار بار نہ دہراؤ۔“

”کیا گفن اور کافور دکھائی دینے لگتا ہے آپ کو۔“ حید ہنس پڑا۔

فریدی پھر کسی خیال میں ڈوب گیا۔

پولیس کے حوالے کر آیا ہے۔ ان دنوں اس کی زندگی کچھ خشک سی گذر رہی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر وہ تفتیش ہی کے بہانے اس سے تھوڑے بہت تعلقات پیدا کر لیتا تو یہ پہاڑ سے دن اور اجاڑ سی راتیں اتنی گراں نہ گذرتیں وہ سوچتا رہا اور فریدی بولتا رہا۔ ”پرویز کی نیند کا سلسلہ شاید ابھی ختم نہ ہو۔ ساہا سال کی بے خوابی کا شکار ذہن کچھ دن آرام ضرور کرے گا جس خلش نے اُسے نیند سے محروم کر دیا تھا وہ رفع ہو گئی۔“

”کون سی خلش؟“ حمید چونک کر بے خیالی میں بولا۔
 ”یہ خلش کہ حمید کی موت فریدی کے ہاتھوں واقع ہوگی۔“ فریدی نے اوپری ہونٹ بھیج کر کہا۔
 ”آخر آپ آج کانٹے کو کیوں دوڑ رہے ہیں۔“
 ”تمہیں یہاں آنے کی بجائے آر لکچو میں جانا چاہئے تھا، ممکن ہے کہ وہ دونوں وہاں روز جاتے رہے ہوں۔“

”میں کہتا ہوں سیدھا راستہ اختیار کیجئے۔“ حمید نے کہا۔ ”پرویز کے نوکروں میں سے کوئی اس آدمی کو ضرور جانتا ہوگا۔ کیونکہ پرویز کا کوئی نوکر ہی اُسے پرویز کے معاملات سے باخبر کر سکتا ہے۔“
 ”مجھے یقین ہے کہ وہ سب اس سے لاعلم ہیں۔“ فریدی کے لہجے میں خود اعتمادی تھی۔

دوسرا پاگل

تین دن گذر گئے۔ لیکن پرویز کی حالت میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہوئی۔ پھر بھی ڈاکٹروں کو توقع تھی کہ وہ خود ہی کسی وقت ہوش میں آجائے گا۔

اس دوران میں فریدی اور حمید دونوں بے حد مشغول رہے۔ حمید نے اپنے شے کے مطابق پرویز کے نوکروں کو ہر طرح ہلایا جلایا لیکن کوئی کام کی بات معلوم نہ ہو سکی۔ آر لکچو کی تحقیقات میں بھی مایوسی ہی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اس سے فریدی نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ رعنا اور وہ گم نام آدمی روزانہ کے گاہکوں میں سے نہیں تھے۔ فریدی پرویز کے کاغذات میں بھی الجھا رہا۔ یہ بھی تو دیکھنا تھا کہ آخر پرویز کون ہے۔ اس کا ذریعہ آمدنی کیا ہے؟ اس کے دوسرے اعزہ بھی ہیں؟ اگر ہیں تو کیا ہیں؟ حمید اس کی مصروفیات میں مغل نہ ہوا اور نہ ہی اس نے اس سے یہی دریافت کیا کہ اسے

”نہ آپ شادی کرتے ہیں اور نہ دوسروں ہی کو شادی شدہ دیکھ سکتے ہیں۔“ حمید نے چٹکی لی۔
 ”میں نہیں چاہتا کہ تمہارا محبوب ترین موضوع غنکو دیر تک جاری رہے۔“ اس نے کہا اور چند لمحے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبائے کچھ سوچتا رہا پھر آہستہ سے بولا۔ ”بہر حال وہ عورت بھی دھوکے ہی میں ماری گئی۔“
 ”کیوں؟“

”تم شاید کچھ اور سوچ رہے ہو۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔ ”وہاں مرنے کی نیت سے تو نہ آئی ہوگی۔“
 ”ظاہر ہے۔“

”میرا تو خیال ہے کہ پرویز یہ جانتا ہی نہ رہا ہو گا کہ وہ بھی اسی شہر میں مقیم ہے۔“ فریدی نے بچھا ہوا سگار سگا کر کہا۔ ”تم بالکل الو ہو! تم نے مجھے فون کیوں نہیں کیا۔ اس دوسری لڑکی کو حراست میں نہ لینا تھا۔“

”کیوں؟“
 ”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“
 ”ہزاروں طریقے تھے۔ خیر جو کچھ بھی ہوا بہتر ہی ہوا۔ اب کیا کرنا ہے؟“ وہ سوالیہ نظروں سے حمید کو دیکھنے لگا۔

”غالباً پرویز کی بیہوشی رفع ہونے کا انتظار ہی بہتر رہے گا۔“ حمید بولا۔
 ”مہمل۔“ فریدی بڑبڑایا۔ ”اس سے کیا ہوگا۔ وہ زیادہ سے زیادہ اپنا اور اس عورت کا تعلق ظاہر کر دے گا۔ اس آدمی کے متعلق شاید وہ بھی کچھ نہ بتا سکے جو اس قتل کا باعث بنا ہے۔“
 ”کیوں؟“

”پھر وہی کیوں؟“ فریدی جھنجھلا گیا۔ ”تم آدمی ہو یا کسی کی نقل۔ یا انیوں کھا رکھی ہے اُس آدمی کو یہ یقین ہو تا کہ پرویز کی شخصیت پر روشنی ڈال سکے گا تو وہ ایسی حرکت ہی نہ کرتا۔“
 حمید کچھ نہ بولا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ آخر فریدی کہنا کیا چاہتا ہے۔

”اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اُس نے اس عورت کو پرویز ہی کے ہاتھوں کیوں قتل کر لیا؟“ فریدی تھوڑی دیر بعد بولا۔
 ”ضرور دیکھئے۔“ حمید نے بے دلی سے کہا۔ وہ حقیقتاً اس لڑکی کے متعلق سوچنے لگا تھا جسے

کچھ کامیابی ہوئی یا نہیں اس کی وجہ دراصل یہ تھی کہ دارو والا بلڈنگ کے غنڈے مار تھا، ضمانت پر رہا ہو گئے تھے اور حمید مار تھا کے ساتھ مصروف تفتیش تھا۔ فریدی نے بھی اس دھیان نہیں دیا۔

آج بھی حمید نے پہلے ہی سے کوئی خاص قسم کا پروگرام بنا رکھا تھا لہذا جب فریدی نے اپنے ساتھ چلنے کو کہا تو وہ پھیل گیا۔

”میں کہیں نہیں جاسکتا! خواہ مجھے بورنہ کیجئے۔ میں پرویز والے معاملے میں الجھا ہوا ہوں۔“ اسی سلسلے میں تمہیں تکلیف دی جا رہی ہے۔“ فریدی بولا۔

”کیوں آپ نے تو کہا تھا کہ میں کسی دوسرے معاملے میں مصروف ہوں۔“

”فی الحال میں نے اُسے ملتوی کر دیا ہے۔“

”لیکن میں دوسرا پروگرام بنا چکا ہوں۔“

”شٹ اپ!...“ فریدی بگڑ کر بولا۔ ”میں جانتا ہوں کہ تم آج کل اسی بہانے کس قسم پروگرام بنا رہے ہو۔ تم کل رات بھی مار تھا کے ساتھ آر لکچو میں رقص کر رہے تھے۔“

”تو پھر!...“ حمید نے آنکھیں نکال کر کہا۔ ”میں اس کی پوجا کر کے تو مجرم تک پہنچ نہیں سکتا۔“

”چلو کپڑے پہنو۔“ فریدی نے اُسے اس کے کمرے کی طرف دھکیلتے ہوئے کہا۔

تھوڑی دیر بعد فریدی کی کیڈیلاک کپاؤنڈ سے سڑک پر نکل رہی تھی۔

”اب تو بتا دیجئے کہ ہمیں کہاں جانا ہے۔“ حمید بے بسی سے بولا۔

”سعید آباد۔“

”کیا!...؟“ حمید اچھل کر بولا۔

”کیوں کوئی خاص بات۔“

”کون سا سعید آباد۔“ حمید نے پھر پوچھا۔

”تو کیا اس صوبے میں کئی سعید آباد ہیں۔“ فریدی خشک لہجے میں بولا۔

”جانتے ہیں آپ کتنی دور ہے سعید آباد۔“

”اٹھاسی میل۔“

”اس بھاگ دوڑ کا مطلب۔“

”پرویز کے سلسلہ نسب کا پتہ چل گیا ہے۔“

”جو غالباً عوج بن عقیق سے ملتا ہوگا۔“ حمید نے بیزاری سے کہا۔

”وہ سعید آباد کے ایک رئیس کا لڑکا ہے۔“

”کیسے معلوم ہوا۔“

”پرویز کے کاغذات سے۔“ فریدی نے کہا۔ ”اس کا سوتیلا بھائی اب بھی غالباً سعید آباد ہی

میں رہتا ہے۔“

”سوتیلا بھائی؟“ حمید چونک کر بولا۔

”ہاں!... لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہمارا شکار وہی ہو۔ ویسے بظاہر اس حادثے کا مقصد یہی

ہو سکتا ہے کہ پرویز کی دولت ہتھیائی جائے۔“

”کیوں؟ یہ کس طرح؟“

”یہ اس طرح کہ اگر اُس شخص کا پتہ نہیں لگتا تو پرویز کا راستہ پھانسی کے تختے تک بالکل

صاف ہے؟“

”اوہ!...“

”لیکن یہ بات پھر بھی صاف نہیں ہوئی کہ اس پراسرار آدمی کو پرویز کے معمولات کا علم

کیونکر ہوا۔“

حمید کچھ نہ بولا۔

تین گھنٹے بعد وہ سعید آباد پہنچ گئے۔ دن ڈھل رہا تھا اور اس چھوٹے سے شہر پر اضطحال سا

طاری ہوتا جا رہا تھا۔ سرور لاج تک پہنچنے میں انہیں کوئی دشواری نہ ہوئی۔ یہ پتھر کی سلوں سے

بنائی ہوئی ایک بہت بڑی عمارت تھی جس کے سامنے ایک کشادہ پائیں باغ تھا۔ باغ کی چہار

دیواری جدید طرز کی تھی۔

فریدی کی کیڈی چھانک سے گذرتی ہوئی پورٹیکو میں جا کر رک گئی۔

حمید کی نظریں جو ہر چیز کا مضحکہ خیز پہلو تلاش کر لینے میں کافی مشاق تھیں یہاں بھی محروم

نہ رہ سکیں۔ اس نے برآمدے میں ایک عجیب الخلق آدمی دیکھا۔ یہ تھا تو نوجوان العمر ہی لیکن

اس نے اپنا حلیہ بڑا مضحکہ خیز بنا رکھا تھا۔ اگر ڈھنگ سے ہوتا تو اس کی شخصیت یقیناً جاذب توجہ

ہوتی۔ اس نے نیلے رنگ کی سلک کا ایک لمبا سا لبادہ پہن رکھا تھا اور پیروں میں غالباً خرگوش کھال کے سلیپر تھے۔ ڈاڑھی مونچھیں صاف تھیں۔ سر کے نیچے حصوں میں گھٹے اور سیاہ بال تھے۔
 بچ کا حصہ بالکل صاف اور سپاٹ تھا۔ شاید اس نے اپنی بھنوں بھی مونڈ رکھی تھیں۔
 فریدی اور حمید کو کار سے اترتے ہوئے دیکھ کر وہ کھڑا ہو گیا لیکن کچھ بولا نہیں۔ البتہ اس کے چہرے پر ایسی الجھن کے آثار نظر آرہے تھے جو تنہائی پسند آدمیوں کی طبیعت کا خاصہ ہوتی ہے۔
 ”ہیلو....!“ اس نے اپنی آنکھوں کو گردش دی۔

فریدی اور حمید اس کے قریب پہنچ چکے تھے۔ حمید کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس کے درمیانی حصے کی صفائی میں قدرت کا ہاتھ نہیں تھا بلکہ اُس پر اُسٹرہ چلایا گیا تھا۔

”کیا تنویر صاحب تشریف رکھتے ہیں۔“ فریدی نے پوچھا۔

”تنویر صاحب تشریف رکھتے ہیں فرمائیے۔“ وہ ہنسنے لگا ہوا آواز میں بولا۔

فریدی نے اپنا ملاقاتی کارڈ اس کی طرف بڑھایا۔

”سی آئی ڈی انسپٹر! گڈ گلڈ....! ہلو۔“ وہ فریدی کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔

”میں تنویر صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔“

”ملے.... ملے....“ تشریف رکھے۔ ”اس نے کرسیوں کی طرف اشارہ کیا۔

حمید نے معنی خیز انداز میں اس کی طرف دیکھا اور پھر فریدی کو گھورنے لگا۔

”اے منڈو!“ اس نے شاید کسی نوکر کو پکارا۔ ”بیگم صاحب کو بولو، سب دودھ بہا جا رہا ہے۔“

”تو آپ ہی تنویر صاحب ہیں۔“ فریدی نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔

”جی ہاں۔“ تنویر نے ہاتھ ملانے کے بجائے اپنی چھڑی فریدی کے ہاتھ میں دے دی اور

دروازے کی طرف دیکھ کر چیخا۔ ”ارے بھی دودھ بہا جا رہا ہے۔“

حمید پر تو لے لگا۔ اگر وہ تنہا ہوتا تو اس کا سر ضرور سہلانا۔

”نہیں بہہ رہا ہے۔“ دروازے سے ایک مترنم قسم کی نسوانی آواز آئی۔

حمید اور فریدی چونک کر مڑے۔ عورت قبول صورت اور دلکش تھی۔ عمر بیس اور پچیس

کے درمیان میں رہی ہوگی۔ دونوں کھڑے ہو گئے۔

”بیگم آپ سے ملے.... فرید احمد صاحب! سی آئی ڈی انسپٹر۔“

”فریدی۔“ فریدی نے مسکرا کر قدرے جھکتے ہوئے تھنج کی۔

”تشریف رکھے۔“ بیگم نے پھر حمید کے کانوں میں شربت کی پچکاری لگائی۔

”سب دودھ بہہ گیا؟“ تنویر نے بچوں کی طرح اُس سے پوچھا۔

”نہیں بہا؟“ وہ جھنجھلا کر بولی۔

”میں پردیز صاحب کے متعلق کچھ پوچھنے کے لئے حاضر ہوا ہوں۔“ فریدی نے کہا۔

”پردیز بھائی!“ مسز تنویر چونک پڑی۔ ”ہاں ہاں فرمائیے۔“

”انہیں ایک حادثہ پیش آگیا ہے؟“

”کب اور کہاں؟“ عورت تقریباً چیخ کر بولی۔

”اوہ....!“ تنویر ہاتھ ہلا کر بولا۔ ”یہ پوچھو! زندہ ہے یا مر گئے۔“

حمید نے اُسے عجیب نظروں سے دیکھا لیکن کچھ بولا نہیں۔

”چپ رہئے۔“ مسز تنویر بگڑ کر بولی۔ پھر فریدی کو مخاطب کر کے کہنے لگی۔ ”کہاں پیش آیا

ہے کیا بات ہے ہمیں تقریباً تین چار سال سے ان کے متعلق کچھ نہیں معلوم ہو سکا۔“

”ہم اُن کے متعلق صرف ایک ہی بات معلوم کرنا چاہتے ہیں۔“ تنویر پھر بولا۔ ”زندہ ہیں یا

مر گئے۔ اگر بیمار ہیں تو کب تک مرجانے کی امید ہے اور یہ کہ کچھ بینک بیلنس بھی ہے یا خالی ہاتھ

مر رہے ہیں۔“

”تنویر ڈارلنگ.... خدا کے لئے۔“ مسز تنویر ہاتھ اٹھا کر بولی۔

”وہ کئی دنوں سے بیہوش ہیں۔“ فریدی نے کہا۔

”ویری گڈ۔“ تنویر اپنی ران پر ہاتھ مار کر اچھلا۔ ”تب تو جلد ہی مرنے کی امید کی جاسکتی ہے۔“

”مجھے افسوس ہے کہ مرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔“ حمید نے اُسے آنکھ مار کر کہا۔

”ہائے سب دودھ بہا جا رہا ہے“ تنویر نے بیوی کی طرف دیکھ کر ہانک لگائی۔

”نہیں بہہ رہا ہے۔“ وہ دانت پیس کر بولی۔ پھر فریدی سے مخاطب ہوئی ”بتائیے نا کیسے

بیہوش ہوئے؟“

”انہوں نے ایک عورت کو مار ڈالا ہے۔“

”ہائے غضب!“ مسز تنویر سینے پر ہاتھ مار کر اچھل پڑی۔

”ایک عورت نے انہیں مار ڈالا۔ ہپ ہپ ہرا۔“ تویر تالی پیٹنے لگا۔
”چپ رہو.... چپ رہو۔“ اس کی بیوی اُسے جھنجھوڑ رہی تھی۔

بشکل تمام تویر خاموش ہوا۔ فریدی اُسے تیز نظروں سے گھور رہا تھا۔

”میں آپ سے کیا عرض کروں۔“ اس کی بیوی جھینپے ہوئے انداز میں کہہ رہی تھی۔
”گر میاں شروع ہوتے ہی ایسے ہو جاتے ہیں۔“

”تو اس خاندان میں سبھی ایسے ہوئے ہیں۔“ حمید نے پوچھا۔

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔“

”مطلب یہ کہ یہ مرض موروثی تو نہیں۔“ فریدی بولا۔

”پرویز بھائی نے کسے قتل کر دیا۔ وہ کون عورت تھی؟“

”رعنا سلیم۔“

”نام تو بڑا حسین ہے۔“ تویر بولا۔ ”خود بھی حسین رہی ہوگی۔ ارے بھی دودھ بہا جا رہا ہے۔“

”نہیں بہہ رہا ہے۔“ اس کی بیوی اس کا شانہ تھکتی ہوئی بولی۔

”رعنا سلیم کون تھی؟“ اس نے فریدی سے پوچھا۔

فریدی نے جیب سے وہی تصویر نکالی، جو حمید کو رعنا سلیم کے فلیٹ کی تلاش کے سلسلے میں ملی تھی۔ اس میں پرویز اور رعنا سلیم دونوں ساتھ تھے۔

”یہ عورت....!“ مسز تویر بے اختیار چیخی۔ ”ہائے غضب ثمنینہ باجی۔“

اُس نے اپنا منہ بازوؤں میں چھپا لیا۔

”ثمنینہ....!“ تویر آہستہ سے بڑبڑایا۔ ”لاؤ دیکھوں تو۔“

اُس نے تصویر زمین سے اٹھالی۔

”بے شک ثمنینہ ہی ہے۔“ اس نے فریدی کی طرف دیکھ کر کہا۔ پھر اپنی بیوی کی طرف

دیکھا جو بازوؤں میں منہ چھپائے رو رہی تھی۔ وہ اُس کے شانے پر ہاتھ مار کر بولا۔ ”ہارے بھی

.... سارا دودھ بہا جا رہا ہے۔“

”دیکھا آپ نے۔“ وہ فریدی کی طرف شکایت آمیز نظروں سے دیکھ کر بولا۔ ”یہ میری

بیوی ہے۔“

”ثمنینہ سے پرویز کا کیا تعلق تھا۔“ فریدی نے اُس کی بات کو نظر انداز کر کے پوچھا۔

”وہ پرویز کی بیوی تھی۔ اس کے ہاتھوں ماری گئی.... اور یہ بیوی بھی....!“

”چپ رہو۔“ مسز تویر چیخ پڑی۔

”کیا ان دونوں کے تعلقات اچھے نہیں تھے؟“ فریدی نے پوچھا۔

”پتہ نہیں!“ تویر منہ چڑھا کر بولا۔ ”تم نے خواہ مخواہ میری منہی منی بیوی کو رلا دیا۔ ثمنینہ

س کی چچا زاد بہن تھی.... ہائے سب دودھ بہا جا رہا ہے۔“

”مترہہ ہونے والی بات ہو کر رہتی ہے۔“ فریدی نے اُسے دلا سا دیا۔

”کیوں مار ڈالا.... انہوں نے کیوں مار ڈالا۔“

”یہ تو ان کے ہوش میں آنے پر معلوم ہوگا۔“

”کیا ہوش میں آ جانے کے امکانات ہیں۔“ تویر نے پوچھا۔

”کیوں نہیں۔“

”تب تو بیہوشی ہی فضول ہے۔“ تویر بولا۔ ”یاد رکھو ان کے بینک بیلنس کے متعلق تو بتاؤ۔“

”تویر تم جانور ہو.... بالکل جانور۔“ اس کی بیوی چیخی۔

”یہ دیکھئے یہ میری بیوی ہے.... میری جان میں بھی تمہیں مار ڈالوں گا۔“

”تمہارا خاندان ہی خونی ہے۔“

”پاندان! کیا کہا پاندان۔“ تویر بڑبڑایا۔ پھر فریدی سے پوچھنے لگا۔ ”آخر خاندان کے نام پر

مجھے پاندان کیوں یاد آ جاتا ہے۔“

تویر کے بیوی نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچے ہوئے کہا۔ ”چلو! اندر چلو۔“

”مائی ڈیئر انسپکٹر رخصت۔“ تویر نے فریدی کی طرف دیکھ کر مایوسی سے کہا۔ ”یہ پاگل

عورت مجھے قبر میں دھکیل کر دم لے گی۔ ہائے سب دودھ بہا جا رہا ہے۔“

”نہیں بہہ رہا! اندر چلو۔“ وہ اُسے دروازے کی طرف دھکیلتی ہوئی فریدی سے بولی۔ ”میں

ابھی آتی ہوں۔“

فریدی اور حمید عجیب نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد

مسز تویر واپس آگئی۔

”ہاں اب بتائیے انسپکٹر صاحب۔“ اُس نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ”پوری گرمیاں مصیبت گزریں گی۔“

”میرا خیال ہے کہ پرویز صاحب کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں تھی۔“
 ”ان لوگوں کی نسل ہی ایسی ہے۔“ وہ راز دارانہ انداز میں بولی۔ ”ان کے باپ بھی تو سے جھکی تھے۔“

”پرویز اور شمینہ کے تعلقات کیسے تھے؟“ فریدی نے پوچھا۔

”پہلے تو اچھے تھے۔“

”پہلے سے کیا مطلب۔“

”پانچ سال قبل ہم سب اکٹھا رہا کرتے تھے۔ اس وقت ان کے باپ حیات تھے۔ ان کے بعد بٹوارہ ہو گیا۔ پرویز نے اپنی غیر منقولہ جائیداد بیچ ڈالی اور شمینہ کو لے کر کہیں چلے گئے۔ بعد ان کا کچھ پتہ نہیں کبھی سننے میں آیا کہ افریقہ میں ہیں۔۔۔ اور کبھی جنوبی افریقہ میں۔“

”شمینہ آپ کی چچا زاد بہن تھی۔“

”جی ہاں۔“

”اس کے والدین کا پتہ بتائیے۔“

”مجھے افسوس ہے کہ میرے علاوہ ان کا کوئی عزیز قریب زندہ نہیں۔“

”تنویر صاحب کے علاوہ پرویز کا کوئی اور وارث۔“ فریدی نے پوچھا۔

”خدا کے لئے تنویر صاحب کی باتوں پر دھیان نہ دیجئے گا۔ گرمیوں بھر اُن کی بھیا رہے گی۔ اکثر مجھ سے کہتے ہیں کہ خدا کرے تم مر جاؤ تو میں دوسری شادی کروں۔ وہ بھی مر تو تیسری کروں اور اسی طرح چوتھی۔۔۔ پانچویں۔۔۔ کل کہہ رہے تھے کہ میں اپنی پلکیں ڈالوں گا۔ کبھی کبھی کہتے ہیں کہ چہرے پر ابھری ہوئی ناک بُری لگتی ہے۔ خوبصورت آدمی چہرہ بالکل ساٹ ہونا چاہئے۔ بعض اوقات اپنے دونوں کان پکڑ کر اکھاڑنے کی کوشش ہیں۔ کہتے ہیں یہ کیا دھڑا دھڑا ہوئے ہیں کیا خدا یہاں کنول کے پھول نہیں لگا سکتا تھا۔ حمید ہنسنے لگا اور آہستہ سے بولا۔ ”انہیں ایک شفا خانے میں داخل کر دیجئے۔ ڈاکٹر شفا خانہ۔۔۔ تین دن میں ٹھیک ہو جائیں گے۔“

”اور یہ دودھ کا کیا قصہ ہے۔“ فریدی نے بُد خیال انداز میں پوچھا۔
 ”دن رات باورچی خانے میں دودھ پکواتے رہتے ہیں۔ ذرا ذرا سی دیر بعد کہتے ہیں دیکھو دودھ بہا جا رہا ہے۔ دودھ کبھی استعمال نہیں کرتے۔ کہتے ہیں کہ مجھے صرف بالائی پڑنے کا منظر بڑا حسین لگتا ہے۔ ہاں آپ نے کسی ڈاکٹر کا نام بتایا تھا۔“
 ”کوئی نہیں! یونہی۔“ فریدی نے جلدی سے کہا۔ ”تو پرویز کا کوئی اور وارث نہیں۔“
 ”جی نہیں! لیکن خدا را۔۔۔ تنویر صاحب کی بات کو کوئی اہمیت نہ دیجئے گا۔“ مسرتویر نے کہا۔

کار میں لاش

کافی رات گئے فریدی اور حمید سعید آباد سے واپس ہو رہے تھے انہوں نے بڑی دیر تک ادھر ادھر سر مارا تھا۔ سعید آباد کی کوتوالی میں بھی کچھ دیر ٹھہرے تھے۔ یہاں ساری پوچھ گچھ تنویر ہی کے متعلق ہوئی تھی۔ تنویر کے خاندان سے واقفیت رکھنے والے بھی یہ نہ بتا سکے کہ پرویز نے کہاں بود و باش اختیار کر رکھی تھی۔ تنویر کے متعلق سب نے تصدیق کی کہ گرمیوں میں اس کا دماغی توازن گڑبڑا جایا کرتا ہے۔

تنویر کا شمار سعید آباد کے نیک نام اور خدا ترس لوگوں میں ہوتا تھا۔ فریدی نے اس کے متعلق جو معلومات فراہم کی تھیں انہیں مد نظر رکھتے ہوئے کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ پرویز والے معاملے میں اس کا بھی ہاتھ ہو سکتا ہے۔

”مگر اس کا پاگل پن عجیب ہے۔“ حمید نے کہا۔

”ہے تو۔“ فریدی آہستہ سے بولا۔ ”لیکن۔“

وہ کہتے کہتے رک گیا۔

”میں اس سے ایک بار پھر ملوں گا؟“ حمید نے کہا۔

”مگر پاگلوں سے تو تم ڈرتے ہو۔“

”سنجیدہ قسم کے پاگلوں سے نہیں۔ میں انہیں پاگلوں سے ڈرتا ہوں جن سے جان پہچان نہ ہو۔ اچھا بھلا بتائیے میں کبھی آپ سے ڈرتا ہوں۔“

فریدی شاید جواب دینے کے موڈ میں نہیں تھا یا پھر شاید کچھ اور سوچ رہا تھا۔

”آپ شاید اس کی بیوی کے متعلق سوچ رہے ہیں۔“ حمید نے کہا۔ ”ہونا بھی چاہیے۔
قدرتی بات ہے۔ جب کوئی مجرد آدمی کسی شادی شدہ جوڑے کو دیکھتا ہے تو دل میں ٹیس ضرور
اٹھتی ہے۔ اگر آج آپ شادی شدہ ہوتے تو آپ کی بیوی بھی بیچاری ملنے والوں سے یہی کہتی کہ
آپ ان کی باتوں کا بُرا نہ ماننے گا۔ یہ چوبیسوں گھنٹے سراغ رساں رہتے ہیں۔“
”یہ بات بھی اب صاف ہو گئی کہ تمہیں پرویز کی بیوی تھی۔“ فریدی بولا۔ ”لیکن پیشہ کرتی تھی۔“
”ٹھیک یاد آیا! آپ نے اس اطلاع سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ وہ پرویز کی بیوی ہی ہو سکتی ہے
آخر آپ نے اس کا اندازہ کیسے لگایا تھا۔“ حمید نے کہا۔

فریدی کچھ دیر تک خاموش رہا پھر بولا۔ ”صرف بیوی ہی کی یوفائی کسی آدمی کو اتنا بھیانک
سکتی ہے۔“

”کیوں؟ کیا کسی محبوبہ کی بے وفائی آدمی کو انتقام پر نہیں اکسا سکتی۔“ حمید نے کہا۔
”اکسا سکتی ہے لیکن ایسے معاملات میں یہ آگ دیر تک نہیں سلگتی۔“ محبوبہ کسی دوسرے کو
ہو کر بچے جننے میں مشغول ہو جاتی ہے اور عاشق کچھ دنوں تک تو دردناک قسم کے فلمی گیت گا
رہتا ہے پھر وہ بھی اپنی راہ لگ لیتا ہے یا زیادہ تاؤ باز ہوا تو موقع ملنے پر انتقام لے لیتا ہے لیکن وہ بھی
پہلی فرصت میں۔ زیادہ دنوں تک یہ روگ نہیں پالتا۔“
”لیکن میں نے تو ایسے بھی عاشق دیکھے ہیں جو محبوبہ کے بچوں سے خود کو ماموں جان
کہلاتے ہیں۔“ حمید بولا۔ ”مگر پرویز۔“

”پرویز تین سال سے تنہا تھا۔“ فریدی نے کہا۔ ”ممکن ہے اُسے علم ہی نہ رہا ہو کہ اس کی
بیوی کہاں ہے اور کیا کر رہی ہے جب کوئی عورت اپنے شوہر کو چھوڑ دیتی ہے تو خواہ شوہر کو اس
سے محبت رہی ہو یا نہ رہی ہو اس کی مردانگی کو ضرور ٹھیس لگتی ہے۔ وہ اسے اپنی مردانگی کی توہین
سمجھتا ہے اور ایک چوٹ کھائے ہوئے سانپ کی طرح انتقام کے لئے جیتا رہتا ہے۔ پرویز نے نہ
مجسمہ اسی لئے بنوایا تھا کہ اپنے اندر بھڑکتی ہوئی آگ پر چھینٹے دیتا رہے۔“

”کیا آپ اسے ورست اور جائز سمجھتے ہیں۔“ حمید نے پوچھا۔
”یہ کسی معلم اخلاق سے پوچھو۔“

”نہیں میں آپ ہی سے پوچھتا ہوں۔ آپ کی ٹانگ تو دنیا کے ہر معاملے میں اڑی ہوئی ہے۔“
فریدی تھوڑی دیر تک خاموش رہا پھر بولا۔ ”میرے خیال میں شادی عورت اور مرد کے
درمیان محض ایک سماجی معاہدہ ہے۔ اگر طرفین میں سے کوئی اس معاہدے کا احترام نہ کرے تو
اس کی سزا موت تو نہ ہونی چاہئے کیونکہ دنیا کا کوئی قانون عہد شکنی پر اتنی سخت سزا نہیں دیتا۔“
”مگر سوال پھر اسی جھنجھلائی مردانگی پر آ پڑتا ہے۔“ حمید نے کہا۔
”جھنجھلائی ہوئی نہیں بلکہ مشتبہ مردانگی کہو۔“
”مشتبہ کیوں؟“

”ایسے معاملات میں بیوی کو قتل کر دینے والے معمولاً اپنی مردانگی میں شبہ رکھتے ہیں۔ لہذا
ان کی غیر شعوری خواہش یہ ہوتی ہے کہ اپنی جنسی کمزوری کے اُس چلتے پھرتے اشتہار کو ہمیشہ
کے لئے ختم کر دیں اور یہ لاشعوری خواہش عموماً دیوانگی کی حد تک بڑھے ہوئے غصے کا لبادہ اوڑھ
رہا ظاہر ہوتی ہے۔ یعنی یہ خواہش منطقی شعور کو احتساب کا موقع ہی نہیں دیتی اور عمل یعنی قتل
مرزد ہو جاتا ہے۔“

”تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ بیویوں کی بد چلنی کی وجہ عموماً شوہروں کی جنسی کمزوری ہوتی ہے۔“
”نہیں ایسا تو نہیں بہترے نامردوں کی بیویاں انتہائی پارسا ہوتی ہیں اور بہترے جوان
مردوں کی طوائفوں سے بھی بدتر۔ مثلاً وہ عورت جو جنسی ابوالہوسی کا شکار ہے۔ فولاد کے آدمی کی
بھی پابند نہیں رہ سکتی۔ اُسے تو بس اپنی زندگی میں ہر آن اور ہر لحظہ نیا پین چاہئے۔“
”جنسی ابوالہوسی کی وجہ کیا ہوتی ہے؟“

”ہوتی ہوگی کچھ مجھے یا تمہیں اس موضوع پر کوئی مضمون نہیں لکھنا ہے۔“ فریدی اکتا کر بولا۔
”لیکن راستہ تو کاٹنا ہے۔“ حمید نے جھٹکے دار آواز میں کہا۔
”تو عورت ہی کا تذکرہ کیوں۔“ فریدی کے لہجے میں جھلاہٹ تھی۔
”محض اسلئے کہ مجھے ایک عورت نے جنم دیا ہے اور عورت ہی قبر تک پہنچائے گی شعر سنئے۔
حباب آسمان میں دم بھرتا ہوں تیری آشنائی کا،
نہایت غم ہے اس قطرے کو دریا سے جدائی کا“
”اے سوریہ تصوف کا شعر ہے۔“ فریدی ہنستا ہوا بولا۔

”یا شیخ! میں جانتا ہوں۔ ہمہ اوست کا دم بھرتا ہوں۔ جب عورت بھی وہی اور مرد بھی تو پھر یہ حجاب کہاں تک درست ہے۔ یہ سارے قطرے ایک دن مل کر دریا بن جائیں گے۔“ ظالم تو تو فرماؤں گے بھی دس ہاتھ آگے نکل گیا۔ اس نے پوری انسانی زندگی کو جہنم کے سانچے میں ڈھالا تھا اور تو نے جنسیت کے ڈانڈے ابدیت سے ملا دیے۔“

”میں اس موضوع پر ایک کتاب لکھنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔“

”تو جھکڑیوں کا ایک جوڑا ابھی سے مخصوص کر لیا جائے۔“

”کیوں جھکڑیاں کیوں۔ واہ جناب Sun Bath اور Health جیسے رسالے تو کھلے عام فرو ہوں اور میری محققانہ تصنیف پر یہ عتاب.... کتاب کا نام ”عشق مجازی سے عشق حقیقی تک ہو لکھو گے کیا؟“ فریدی مسکرا کر بولا۔

”یہی لکھوں گا کہ عورت اور مرد کے تعلقات پر کسی طرح کی پابندی عائد نہ کرنا حسن سے کھلی ہوئی غداری ہے۔ غداروں کو کسی طرح معاف نہیں کیا جاسکتا۔ تصوف زندہ باد اور سب کچھ مردہ باد۔ علماء کرام بایکات وغیرہ وغیرہ۔“

”تمہارے والد صاحب ابھی زندہ ہیں۔“

”اور میری کتاب پڑھ کر ان کی زندگی اور بڑھ جائے گی۔“ حمید ہنس کر بولا۔ ”کیا سچے آپ میرے ابا میاں کو.... میں جو کچھ بھی ہوں انہیں کی بدولت ہوں۔ یہ تصوف میر انہیں سے سیکھا ہے۔ ایک بار کا لطیفہ سنئے۔“

حمید نے رک کر ایک زوردار قہقہہ لگایا اور پھر بولا۔ ”میں یہی کوئی بارہ تیرہ برس کا رہا۔ ابا میاں کے شباب کا زمانہ تھا۔ ایک رات ایک صاحبہ مردانخانے میں تشریف لائیں۔ دوڑا ہوا والدہ صاحبہ کے پاس گیا اور انہیں گھبراہٹ میں یہ خبر دی کہ ابا میاں ابھی ابھی بوتلیں اپنے ساتھ لائے ہیں، اور انہوں نے مردانخانے کا دروازہ بند کر لیا ہے۔ والدہ صاحبہ کی رنگین مزاجی سے تو واقف تھیں لیکن یہ بوتلوں والی اطلاع ان کے لئے بالکل نئی تھی۔ میں وہ چھت پر چڑھیں اور ادھر ہی سے مردانخانے میں چلی گئیں۔ پھر میں جو بھاگا ہوں تو یہاں جا کر پناہ لی۔ مگر دوسرے دن اس بُری طرح ادھیڑا گیا ہوں کہ خدا کی پناہ۔“

”ابے سور۔“ فریدی ہنسنے لگا۔

”دوسرا لطیفہ سنئے! اُس وقت میری عمر پانچ یا چھ سال رہی ہوگی۔ ابا نے ایک دن مجھ سے پوچھا کہ تم بڑے ہو کر کیا بنو گے۔ میں نے جواب دیا رنڈی۔ وہ منہ پھاڑ کر مجھے گھورنے لگے پھر بولے کیا کہتا ہے۔ میں نے کہا مای خالہ جان سے کہہ رہی تھیں کہ آپ رنڈیوں کو بہت چاہتے ہیں۔“

”کیوں غپ ہانک رہا ہے۔“ فریدی بولا۔

”خدا قسم۔“

”خیر حمید صاحب! اگر تم مرد نہ ہوتے تو رنڈی ہی ہوتے۔“

”ہائے ہائے کیا زمانہ تھا۔“ حمید سینے پر ہاتھ مار کر بولا۔ ”بارہ تیرہ برس کی عمر میں مجھے ایک صاحبہ کی بیوی سے عشق ہو گیا تھا.... ہائے.... خدا کی قسم میں اس کے مہندی لگے ہوئے نرم و نازک ہاتھ کبھی نہ بھلا سکوں گا اور وہ ابھرے ہوئے ہونٹوں کے گرد لرزتی باریک سی نتھ۔“

”نتھ! لا حول ولا قوۃ۔“ فریدی نے بُرا سامنہ بنالیا۔ ”کیا وہ تمہاری کوئی رشتہ دار تھی۔“

”ہاں! میرے باپ کے چھوٹے سالے کی بیوی۔“

”یعنی تمہاری ممانی۔“ فریدی نے حیرت سے کہا۔

”اب تو ممانی ہی ہیں۔ مگر اُس زمانے میں میں نے سنجیدگی سے خواہش کی تھی کہ کاش وہ میری بیوی ہوتیں۔“

”تم سے بڑا سو آج تک میری نظروں سے نہیں گذرا؟“

”آپ تو سو کہہ کر رہ گئے لیکن ابا میاں اور امی نے خاصی پٹائی کی۔“

”کیا انہیں معلوم ہو گیا تھا۔“ فریدی کے لہجے میں حیرت تھی۔

”میں نے کبھی چھپ کر عشق نہیں کیا۔“ حمید بولا۔ ”ایک دن میں نے ممانی کو ایک عدد خط لکھ دیا۔ لکھا کیا تھا ایک ناول سے نقل کر دیا تھا۔ اس پر ممانی نے میرے کان تھام کر دو تھپڑ اور اموں نے ہزاروں قہقہے لگائے۔ والدین تک خبر پہنچی تو انہوں نے الگ ادھیڑا۔“

”اُس کے بعد پھر کبھی سامنا کرنے کی ہمت پڑی تھی۔“ فریدی نے پوچھا۔

”خدا کی قسم! اموں کے سامنے انہیں آنکھ مار کر مونچھوں پر تاؤ دیا کرتا تھا وہ دونوں میاں بیوی تو یہی سمجھتے تھے کہ میں نے ان کی چڑھ نکال رکھی ہے۔ مگر میں سنجیدگی سے عاشق ہوا تھا۔“

”اور اب۔“

”اب تو وہ سو فیصدی ممانی ہو گئی ہیں۔“ حمید ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ ”لیکن اب اپنے ذہن کو کریدتا ہوں تو اس نکتہ کے علاوہ اور کچھ نہیں ہاتھ آتا۔ مجھے دراصل اُن کی بڑے عشق تھا۔ ہر وہ شخص جو مجھ سے قریب ہے اُسے میں تصور میں نکتہ ضرور پہناتا ہوں۔ مگر آپ سے محبت ہے آپ کی عدم موجودگی میں جب بھی آپ کی تصویر میرے ذہن پر ابھرنے آپ کی ناک میں نکتہ ضرور ہوتی ہے اور نکتہ کے بیچ میں سگار۔“

”مارتے مارتے اُلو بنا دوں گا۔“ فریدی جھپٹی ہوئی لمبی کے ساتھ بولا۔

”میں نے لمبی لمبی ڈاڑھیوں پر تھیں لہراتی محسوس کی ہیں۔“ حمید نے غمگین آواز میں کہا۔ ”کیڈی لاک سنسان سڑک پر پھسلتی جا رہی تھی۔ دفعتاً مخالف سمت سے ایک کار برق رفت سے آئی اور گذر گئی۔“

”کیوں....؟“ فریدی بے ساختہ چونکا۔ ”کیا یہ چیخ نہیں تھی۔“

اس نے اپنی کار کی رفتار کم کر دی اور پلٹ کر دیکھنے لگا۔ دوسری چیخ حمید نے بھی صاف لیکن آواز دور کی تھی۔ فریدی نے تیزی سے کیڈی پیچھے کی طرف موڑی۔ سڑک کے وہ طرف گھٹی جھاڑیوں اور چھپول کے گنجان جنگلوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ دو تین فرلانگ ایک کار کھڑی ہوئی دکھائی دی جس کا انجن بند نہیں کیا گیا تھا۔

کار کے قریب پہنچ کر انہوں نے عجیب منظر دیکھا۔ اگلی سیٹ کی بائیں جانب کار دروازہ کھلا تھا۔ ایک آدمی جس کا سر پائیدان پر ٹکا ہوا تھا اور بقیہ حصہ کار کے اندر دکھائی دیا۔ فریدی نے گاڑی کی روشنی نہیں گل کی تھی۔ لیکن یہ کار ہیڈ لائٹس کی ریخ میں نہ ہونے کی بناء پر کافی میں نہیں تھی۔

”نارج لاؤ۔“ فریدی نے حمید سے کہا۔

حمید کیڈی کی طرف دوڑا۔ وہ نارج تو نکال لایا، لیکن انجن بند کرنا وہ بھی بھول گیا تھا۔ فریدی نے اوندھے پڑے ہوئے آدمی کو سیدھا کیا۔ چہرے پر نارج کی روشنی پڑتے ہی وہ چونک اٹھا۔ ”اوہ.... کہیں دیکھا ہے اسے.... مگر یہ مر چکا ہے۔“

زخروں پر تیز قسم کے ناخنوں کے نشانات تھے۔ کسی نے زخرا اس شدت سے دباؤ ناخن گوشت میں اتر گئے تھے۔

”وہ اسی طرف ہو گا۔“ فریدی تیزی سے بائیں سمت کی جھاڑیوں کی طرف مڑا۔ نارج حمید کے ہاتھوں میں تھی۔ جب تک وہ اُسے روشنی دکھائے فریدی جھاڑیوں میں کود چکا تھا۔ حمید بھی چھپا پھر وہ دونوں دور تک چھپول کے جنگلوں میں گھستے چلے تھے۔ دفعتاً فریدی نے حمید سے کہا۔ ”تمہیں وہیں ٹھہرنا چاہئے تھا۔ چلو.... واپس چلو۔“ وہ پھر سڑک کی طرف دوڑا۔ فریدی نے جھاڑیوں میں گھسنے سے پہلے نہ تو اپنی گاڑی کا انجن ہی بند کیا تھا اور نہ روشنی ہی بجھائی تھی۔

”یا تو کیڈی لگی یادہ کار۔“ فریدی نے حمید سے کہا۔ وہ دوڑ رہا تھا۔

”کیوں....؟“ حمید ہانپتا ہوا بولا۔

”سڑک پر روشنی نہیں دکھائی دیتی۔“

وہ پوری قوت سے دوڑنے لگے تھے، فریدی کا اندازہ درست نکلا۔ لاش والی کار غائب تھی اور فریدی کی کیڈی کا انجن بند کر کے روشنی گل کر دی گئی تھی۔

”جلدی کرو۔“ وہ چھپٹ کر کار میں بیٹھا لیکن دوسرے ہی لمحے میں وہ کسی زخمی بھیڑیے کی طرح غرا رہا تھا۔ کئی بار کی کوشش کے باوجود بھی انجن اسٹارٹ نہ ہوا۔

”کیا حماقت ہوئی ہے۔“ وہ نیچے اتر کر انجن کا ڈھکن اٹھاتا ہوا بولا۔ ”نارج ادھر لاؤ۔“

”چوٹ دے گیا۔“ حمید چاروں طرف دیکھتا ہوا بولا۔

”جلد بازی ہمیشہ بُرے نتائج سے دوچار کرتی ہے۔“ فریدی نے کہا۔ ”مجھ سے غلطی ہوئی۔“

”کار موڑی نہیں گئی۔“ فریدی نے نارج کی روشنی زمین پر ڈالتے ہوئے کہا۔ پھر دفعتاً تیزی سے جھکا۔ دوسرے لمحے میں حمید نے اس کے ہاتھ میں ایک انگوٹھی دیکھی جس پر ہیرے کے

تین چھوٹے چھوٹے نگ جگہ گار ہے تھے۔ فریدی اُسے جیب میں ڈال کر کیڈی کی طرف جھپٹا۔ وہ پھر سعید آباد کی طرف جا رہے تھے لیکن اس بار گاڑی کی رفتار بہت تیز تھی۔

”کیا آپ نے کسی کو دیکھا تھا۔“ حمید نے پوچھا۔

”نہیں۔“

”تو پھر اس بدحواسی کا کیا مطلب۔“

”اچھا تو تم یہ سمجھتے ہو کہ اس لاش نے یہ سب حرکتیں کی ہیں۔“

جلد نمبر 9

”کیا آپ تنویر پر شبہ کر رہے ہیں۔“ حمید نے پوچھا۔
”قطعی۔“

”وجہ۔“

”میں اس وقت کسی بحث میں پڑنے کے لئے تیار نہیں۔ میں نے اس کے متعلق ایک بہت ہی اہم بات نہیں معلوم کی۔“

کیا.....؟“

”یہی کہ وہ عموماً گرمیوں میں ہمیشہ اپنی بھنوں وغیرہ کی صفائی کر دیتا ہے۔“

”بھئی میرا خیال ہے کہ اگر اس کا اس معاملے سے کوئی تعلق ہو تا تو وہ پرویز کے بینک بیلنس

وغیرہ کے متعلق کچھ نہ پوچھتا۔“

”ظاہر ہے کہ وہ خود کو پاگل بنا کر پیش کر رہا ہے۔“ فریدی بولا۔

”تو کیا وہ ہر سال گرمیوں میں پاگل بننے کی مشق کرتا ہے۔“ حمید نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔

”اس کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ لیکن مجھے اس پر یقین ہے کہ وہ پاگل نہیں ہے۔“

”آخر اس یقین کی کوئی وجہ بھی ہوگی۔“ حمید نے کہا۔

”اس کی آنکھیں.... پاگلوں اور ہوش مندوں کی آنکھوں میں بڑا فرق ہوتا ہے۔“

”چلے صاحب۔“ حمید اکتائے ہوئے لہجے میں بولا۔

تھوڑی دیر بعد کیڈی سرور لاج کے سامنے پہنچ کر رک گئی۔ پھانگ بند تھا۔ تقریباً آٹھ یا

وس منٹ تک انہیں پھانک ہلانا پڑا۔ شاید چونکہ کیدار سوراہا تھا۔

”کون ہے؟“ اندر سے بھرائی ہوئی آواز آئی۔

”پولیس.....!“

”پپ... پپ... پولیس... کیوں؟“

”دروازہ کھولو۔“ حمید نے پھاٹک پر لات ماری۔

”شش یہ نہیں۔“ فریدی نے آہستہ سے کہا۔

”بیگم صاحب کے حکم کے بغیر.... نہیں کھل سکتا۔“ اندر سے آواز آئی۔

”اُن سے کہو انسپکٹر فریدی ہے۔“

حمید کچھ نہ بولا۔ واقعات کے اُس ڈرامائی انداز نے اُسے کچھ سمجھنے ہی نہیں دیا تھا۔ اُس مرنے والے کے زخروں پر ناخنوں کے نشانات نہ دیکھتا تو مشکل ہی سے یقین آتا کہ وہ قدر موت نہیں مرا۔ کارڈرائیور کرتے کرتے ہارٹ فیل بھی تو ہو سکتا ہے؟

فریدی خاموشی سے اسٹرنگ پر جھکا ہوا تھا۔ کیڑی ساٹھ میل کی رفتار سے دوڑ رہی تھی۔ تقریباً تیس میل نکل آئے تھے اور سعید آباد بہت زیادہ دور نہیں رہ گیا تھا۔ دفعتاً انہیں تیز روٹ دکھائی دی اور پھر جلد ہی اُس روشنی کا معمہ بھی حل ہو گیا۔ سامنے بچ سڑک پر ایک کار شعلہ میں گھری کھڑی تھی۔ فریدی نے جھلا کر ان پر ہاتھ مارا اور کیڑی روک دی۔

”جانتے ہو! وہ کس کی لاش تھی۔“ اس نے بے چینی سے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

”نہیں۔“

”یہ جاپانیز مرچنٹس کارپوریشن کا وہی ایجنٹ تھا جس نے وہ مجسمہ پرویز کے یہاں پہنچایا تھا۔“

اب قاتل نے اس کی لاش بھی جلادی۔“

دیوار پھٹی ہے

فریدی چند لمحے کچھ سوچتا رہا پھر اس نے کیڑی اشارت کر دی۔ بشکل تمام اس نے گاڑی آگے بڑھایا۔ یہ بھی بڑا خطرناک کام تھا کیونکہ جلتی ہوئی کار کے شعلوں نے سڑک کی پورے چوڑائی کو گھیر رکھا تھا بس مقدر رہی تھا کہ کیڑی آگے نکل گئی۔

”اب کہاں۔“ حمید نے کہا۔

”سعید آباد... سرور لاج۔“

”اوہ تو کیا....؟“

”میں تنویر کو چیک کروں گا۔“ فریدی آہستہ سے بڑبڑایا۔ ”آخر اس نے بھنویں کیوں صاف کر رکھی ہیں۔ سرکار میانی حصہ کیوں منڈوا دیا ہے۔“

”تو کھوڑی چپک کریں گے آپ اس کی۔“ حمید مضحکانہ انداز میں بولا۔

کیڈی کی رفتار اور تیز ہو گئی۔ حمید نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی کی طرف دیکھا۔ دو بج رہے تھے۔

اندر قدموں کی چاپ سنائی دی جو بتدریج دور ہوتی گئی۔

”آخر آپ کس طرح چپک کریں گے۔“ حمید آہستہ سے بولا۔

”بس دیکھتے رہو۔“

”اگر وہ تنویر ہی رہا ہوگا تو محتاط ہو گیا ہوگا اور پھر میرا خیال ہے کہ اس کی بیوی بھی ارحکوتوں سے لاعلم نہ ہوگی۔“

”خدا جانے۔“

”اگر وہ تنویر ہی تھا۔“ حمید بولا۔ ”تو یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ وہ واپس ہی آگیا ہو۔ کیونکہ

کار تو اس نے جلادی تھی۔“

”ٹھیک ہے۔“ فریدی نے کہا۔ ”لیکن یہ تو سوچو کہ اُس نے وہ کار وہیں کیوں نہ جلادی؟ اُس نے اُسے پہلے چھوڑا تھا۔ اتنی دور جانے کے بعد جلانے کی وجہ کے متعلق بھی تو غور کرو۔ حمید کچھ نہ بولا۔ فریدی ہی نے تھوڑی دیر بعد کہا۔

”اُس نے یہ سارے انتظامات پہلے ہی سے کر رکھے ہوں گے۔ ہم یہاں سے سات بجے گئے تھے۔ ساڑھے آٹھ بجے یہاں سے ایک میل ٹرین جاتی ہے جو تقریباً دو گھنٹے میں ہمارے تک پہنچ جاتی ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ جانے سے پہلے اس نے اُسی مقام پر جہاں وہ کار جل تھی ایک موٹر سائیکل چھپادی ہو۔“

”تو اسے یہاں لاکر مارنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔“

”شہر میں اُسے لاش جلانے کا موقع نہ ملا۔“

”پھر بھی اسی وقت یہاں آنے کی منطق میری سمجھ سے باہر ہے۔“ حمید نے کہا۔

”کیوں؟“

”ظاہر ہے کہ وہ اپنی کار بھی دیکھ چکا ہے۔ اُس نے اندازہ لگالیا ہوگا کہ یہ ہم ہی ہیں۔ اس وہ کافی محتاط ہو گیا ہوگا۔“

”میں کہتا ہوں تم بس دیکھتے جاؤ۔“

”اندھیرے میں دکھائی بھی تو نہیں دیتا۔“ حمید نے جھنجھلا کر کہا۔

اندر پھر قدموں کی آہٹیں سنائی دیں۔

”یہاں بات ہے.... کون صاحب ہیں۔“ بیگم تنویر کی کپکپاتی ہوئی مترنم آواز آئی اور حمید کی نڈاسی آنکھیں یک بیک جاگ اٹھیں۔

”میں ہوں انسپکٹر فریدی۔“ فریدی نے معذرت آمیز لہجے میں کہا۔

”یہاں بات ہے۔“ اندر سے آواز آئی پھر بیگم تنویر نے شاید چونکدار کو مخاطب کیا۔ ”پھانگ کھول دو۔“

کرکڑاہٹ کے ساتھ پھانگ کھلا اور فریدی نے نرم لہجے میں کہا۔

”مسز تنویر مجھے افسوس ہے لیکن اس وقت یہاں میرا آنا بہت ضروری تھا۔“

”فرمائیے! اگر دیر تک ٹھہرنا ہو تو اندر چلئے۔“ اس کے لہجے میں اکتاہٹ تھی۔

وہ سب ایک بڑے کمرے میں آئے۔ مسز تنویر نے گہرے نیلے رنگ کی سلک کا سلپنگ

کاون پین رکھا تھا.... اور پیروں میں سیاہ مخملی چپلیں تھیں۔ چہرہ اس وقت پہلے سے زیادہ حسین معلوم ہو رہا تھا۔

وہ فریدی اور حمید کی طرف جواب طلب نظروں سے دیکھنے لگی۔

”آپ کا خاندان خطرے میں ہے۔“ فریدی نے کہا۔

”جی؟“ وہ بے ساختہ چونک پڑی۔

”تنویر صاحب کہاں ہیں۔“

”اپنے کمرے میں سو رہے ہیں.... بات کیا ہے؟“ اُس کی آواز کپکپا رہی تھی۔

”ذرا! نہیں جگا دیجئے۔“

”جگا دوں.... لیکن....“ لہجے میں ہچکچاہٹ تھی۔ ”آخر آپ بتاتے کیوں نہیں۔“

”محترمہ میں آپ کو ان الجھنوں میں نہیں ڈالنا چاہتا۔“ فریدی نے نرم لہجے میں کہا۔

”اور میں آپ کو یقین دلانا چاہتی ہوں کہ اُن سے کسی معاملے پر گفتگو کرنا فضول ہے۔“

”کیا ان کا ذہنی توازن اتنا ہی بگڑا ہوا ہے۔“ فریدی نے پوچھا۔

”جی ہاں۔“

”ایک بات اور.... کیا وہ ہمیشہ ایسی حالت میں اپنی یہی وضع قطع بنائے رہتے ہیں۔“

”جی ہاں۔“

”بھنوس وغیرہ صاف کرا دیتے ہیں۔“

”جی ہاں! لیکن آپ یہ کیوں پوچھ رہے ہیں۔“

”بہتر یہی ہوگا آپ انہیں جگادیں۔“

”اور اگر فرض کیجئے وہ نہ جاگے تو۔“

”جاگیں گے کیوں نہیں۔“ فریدی نے اتنے بھولے پن سے پوچھا کہ حمید اس پر قہر

ہوتے ہوتے رہ گیا۔

”وہ اکثر تین تین دن تک نہیں جاگتے۔“ مسز تنویر بولی۔

حمید چونک کر اُسے گھورنے لگا لیکن فریدی کے انداز سے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اُس

کوئی غیر متوقع بات نہ سنی ہو۔

”اوہو....!“ فریدی بولا۔ ”تو اُنکے اور پرویز صاحب کے مرض کی نوعیت ایک ہی ہے۔“

”کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر کے، جو سونا شروع کرتے ہیں تو اکثر تیسرے ہی

دروازہ کھلتا ہے۔ اس دوران میں کتنا ہی شور مچائیے! دروازہ پیٹنے لیکن شاید وہ کروٹ تک

لیتے۔ ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ جب یہ کیفیت ہو تو انہیں اٹھایا ہی نہ جائے۔ اگر وہ زبردستی جگائے۔“

اُن کا ہارٹ فیل ہو جائے گا۔“

”بالکل یکساں حالات ہیں۔“ فریدی آہستہ سے بولا۔ پھر چونک کر کہنے لگا۔ ”محترمہ ذی

زور دیجئے۔ کیا آپ کا کوئی ایسا عزیز بھی ہے جسے پرویز اور تنویر صاحبان کا ترکہ پہنچ سکے۔“

”کوئی نہیں.... کوئی بھی نہیں۔ خدا راجھے الجھن میں نہ ڈالے۔“

”تنویر صاحب کس وقت سونے کے لئے گئے تھے۔“ فریدی نے پوچھا۔

”آپ لوگوں کے جانے کے بعد ہی انہوں نے کھانا کھایا اور اس کے بعد سونے چلے گئے

”انداز اکیا وقت رہا ہوگا۔“

”غالبا ساڑھے سات۔“

”کیا آپ مجھے اُن کے کمرے تک لے چلیں گے۔“

”کچھ بتائیے بھی۔“ وہ جھنجھلا کر بولی۔ ”اس طرح خواہ خواہ تک کرنے سے کیا فائدہ۔“

”محترمہ میں ایک بار پھر تکلیف دہی کی معافی چاہتا ہوں۔“ فریدی نے معذرت کی۔

نہیں چاہتا تھا کہ آپ کو کسی الجھن میں ڈالوں۔ لیکن اب بتانا ہی پڑے گا۔“

فریدی نے مختصر آپریز کی روداد دہرا دی۔ لیکن اس نے یہ نہیں بتایا کہ پرویز کی بیوی اُسے

چھوڑ کر طوائفوں کی سی زندگی بسر کرنے لگی تھی۔ اُس کے متعلق اُس نے یہ بتایا کہ دونوں کسی

رجش کی بناء پر علیحدہ ہو گئے تھے۔ پرویز کو اس قدر غصہ تھا کہ اُس نے اپنی بیوی کا ایک مجسمہ بنوا کر

اپنے انتہائی جذبے کی تسکین کا درجہ پیدا کر لیا تھا۔ پھر اُس نے یہ بتایا کہ کسی نے اس کی بیوی کو

دھوکہ دے کر اُس کمرے میں پہنچا دیا جہاں وہ مجسمہ رکھا ہوا تھا اور پرویز نے مجسمے ہی کے دھوکے

میں اُس کا گلا دبا دیا۔“

تنویر کی بیوی بہت زیادہ خوفزدہ نظر آرہی تھی۔

”آپ ڈر رہی ہیں نا۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔ ”میں اسی لئے آپ کو کچھ نہیں بتانا چاہتا تھا۔“

”نہیں میں ڈر نہیں رہی ہوں۔ آخر وہ کون ہو سکتا ہے۔“

”وہ ایسا ہی آدمی ہو سکتا ہے جسے پرویز کی موت کے بعد کوئی فائدہ پہنچ سکے۔ ظاہر ہے کہ وہ

پھانسی سے نہ بچ سکے گا۔ میں تنویر صاحب کے لئے بہت فکر مند ہوں۔“

مسز تنویر بہت زیادہ بے چین ہو گئی۔

”اور سنئے! میں نے ابھی راستے میں اُس ایجنٹ کی لاش دیکھی ہے جس کی معرفت پرویز نے

وہ مجسمہ بنوایا تھا۔ لہذا مجھے واپس آنا پڑا۔ اس لئے کہ جلد یا بدیر آپ لوگوں پر بھی حملہ ہو سکتا ہے

کہ قاتل کو پرویز صاحب اور اس مجسمے کے متعلق ایجنٹ ہی سے معلوم ہوا ہوگا۔“

”اور اس نے اس ایجنٹ کو بھی مار ڈالا۔“

”جی ہاں۔“ فریدی جلدی سے بولا۔ ”میں پرویز صاحب کا کمرہ دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”میں عرض کر چکی ہوں نا کہ وہ اندر سے دروازہ بند کر کے سوتے ہیں۔“

”آپ کی مرضی۔“ فریدی اٹھتا ہوا بولا۔ ”میں نے آپ کو خطرات سے آگاہ کر دیا۔ اب

آپ جانیں۔“

”ٹھہریے! میں بھلا کیا کر سکتی ہوں! آپ خود چل کر دیکھ لیجئے کہ کمرہ اندر سے مقفل ہے۔“

”چلے!“ فریدی بولا۔

مسز تنویر ایک کمرے کے سامنے پہنچ کر رک گئی۔ فریدی نے دروازے کو دھکا دیا۔ لیکن وہ

اندر سے بند تھا۔ اس نے کوئی ایسا سوراخ یا جھری تلاش کرنے کی کوشش کی جس سے اندر جو جاسکے۔ لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ دروازے کے دونوں طرف کھڑکیاں تھیں لیکن وہ بھی بند تھیں اور ان میں بھی شیشے نہیں تھے۔“

کمرے کے اندر سے بجلی کا چمکا چلنے کی آواز آرہی تھی۔

کافی اونچائی پر ایک روشندان نظر آیا جو کھلا ہوا تھا اور اس کے اندر گہرے نیلے رنگ کی روشنی دکھائی دے رہی تھی۔

”دوسری طرف بھی دروازہ ہوگا۔“ فریدی نے آہستہ سے پوچھا۔

”نہیں۔“

”کوئی کھڑکی۔“

”کھڑکی بھی نہیں ہے۔“

”یعنی اگلی دیوار کے بعد کوئی دیوار نہیں ہے۔ اگر دروازہ ہوتا تو مکان کی پشت پر کھلتا۔“

”جی ہاں۔“

”عجیب بات ہے۔“ فریدی بولا۔ ”وہ کمرہ بھی ایسا ہی تھا جس میں پرویز کی بیوی کی لاش گئی تھی۔ عجیب معاملہ ہے مگر ہاں اس میں تو نقب لگائی گئی تھی۔“

”خدا کے لئے کچھ کیجئے۔“ مسز تنویر مضطربانہ انداز میں بولی۔

”بائس کی سیڑھی ہوگی۔“ فریدی نے پوچھا۔

”جی ہاں۔“

”ذرا جلدی سے منگوائیے۔“ فریدی نے کہا۔

نوکری بھی بیدار ہو گئے تھے اور وہ کچھ دور پر کھڑے ان لوگوں کو عجیب نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد سیڑھی آگئی۔ فریدی نے اُسے روشندان سے لگا دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے

چڑھ گیا۔ کمرے کے اندر نیلے رنگ کی روشنی پھیلی ہوئی تھی اور وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ مسہر

پر تکلف بستر ضرور لگا ہوا تھا۔ لیکن وہ بالکل خالی تھی۔ تنویر کا پیلے رنگ کا لباس جو اس نے

پہن رکھا تھا، بیٹگر پر لٹکا ہوا نظر آیا۔ دوسری طرف یا ادھر ادھر کی دیواروں میں نہ کوئی

دکھائی دی اور نہ دروازہ۔

فریدی چپ چاپ نیچے اتر آیا۔ پھر نوکروں کو مخاطب کر کے بولا۔

”تم لوگ جا کر آرام کرو۔“

”کیا بات ہے۔“ مسز تنویر اُسے جھنجھوڑ کر بولی۔ فریدی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل رہی

تھی۔ وہ نوکروں کے چلے جانے کا منتظر رہا۔

”محترمہ مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ مجھے اس طرح اُلو بنائیں گے۔“ اس نے کہا۔

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔“ مسز تنویر کے لہجے میں حیرت تھی۔

”کمرہ بالکل خالی ہے۔“

”جی۔“ اُس نے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ ”ناممکن..... قطعی ناممکن۔“

”آپ خود دیکھ لیجئے۔“ فریدی نے روشندان کی طرف اشارہ کیا۔

مسز تنویر چند لمحے فریدی کے چہرے پر نظر جمائے رہی پھر سیڑھی کی طرف بڑھی۔

فریدی اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے قدم لڑکھڑاہے تھے۔

روشندان میں جھانکتے ہی وہ بے اختیار چیخ پڑی۔ سیڑھی کے ڈنڈے اس کی گرفت سے نکل

گئے اگر فریدی نے جھپٹ کر اُسے ہاتھوں پر نہ روک لیا ہوتا تو وہ بھی اپنی پچازاد بہن شمیمہ کے

پاس پہنچ گئی ہوتی۔ وہ بیہوش تو نہیں ہوئی تھی لیکن حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ اپنے پیروں پر

کھڑی ہو سکتی۔ فریدی نے اُسے برآمدے میں پڑی ہوئی کرسی پر ڈال دیا۔

اب حمید سیڑھی پر چڑھ رہا تھا۔ روشندان میں جھانکنے پر اُسے یہ سمجھنے پر مجبور ہو جانا پڑا کہ

تنویر کی بیوی نے انہیں دھوکے میں رکھا تھا۔ وہ نیچے واپس آنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ سامنے کی

دیوار میں نیچے سے اوپر تک ایک دراڑ سی پڑ گئی جو دیکھتے ہی دیکھتے کافی کشادہ ہوتی جا رہی تھی۔ حمید

نے پیچھے پلٹ کر..... فریدی وغیرہ کو چپ رہنے کا اشارہ کیا اور پھر دوسرے ہی لمحے میں اُس نے

بیسٹ سے ریوالور نکال لیا۔ فریدی مسز تنویر کی طرف سے بے خبر نہیں تھا۔ حمید کو ریوالور نکالتے دیکھ

کر اُس نے مسز تنویر کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو اس کی چیخ کسی طرح نہ رک سکتی۔

ایک آدمی کمرے میں داخل ہوا اور دیوار پھر برابر ہو گئی۔ لیکن یہ تنویر نہیں تھا۔ اس کے

بال کٹے، گھونگھریالے اور پیچھے کی طرف مڑے ہوئے تھے، غدد خال جاذب توجہ اور دلکش تھی،

جوان اور صحت مند تھا۔

”خبردار...!“ حمید نے روشندان سے للکارا۔ ”اگر بھاگنے کی کوشش کی تو گولی مار دوں گا۔“ اس نے گھبرا کر اوپر دیکھا اور روشندان میں ریوالتور دیکھ کر اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے۔ ”کیا بات ہے؟“ فریدی نے نیچے سے پوچھا۔
”دروازہ توڑ دیجئے۔“

حمید نے محسوس کیا کہ وہ آدمی آہستہ آہستہ دیوار کی طرف کھسک رہا ہے۔

”اپنی جگہ کھڑے رہو۔“ حمید نے للکارا۔ فریدی دروازے سے شانہ لگائے زور کر رہا۔ دروازہ کچھ زیادہ مضبوط نہیں معلوم ہوتا تھا۔ اذھر دروازے میں چڑچڑاہٹ ہوئی اور اذھر نہ بڑھ گیا ہوا کہ حمید سیر ہی سمیت دیوار پر پھسلتا ہوا اپنے چلا آیا۔ خیریت یہ ہوئی کہ ریوالتور نہیں ہ دروازہ ٹوٹ چکا تھا۔ فریدی حمید کی پرواہ کئے بغیر اندر گھس پڑا۔ کمرہ خالی تھا اور سامنے والی دیوار میانی خلا بدستور قائم تھی۔ فریدی دیوانہ وار اُس سے گذر کر مکان کی پشت پر آگیا۔ کافی فاصلے پر سامنے ایک تاریک سایہ دوڑ رہا تھا۔ فریدی نے بے تحاشہ اس کے پیچھے بھاگنا شروع کر دیا۔ فریدی نے اُسے جلد ہی جالیا۔ بہر حال وہ بہت زیادہ طاقتور ثابت نہیں ہوا۔ شاید گھبراہٹ ہوا بھی تھا۔ اس لئے اس نے جلد ہی ہاتھ پیر ڈال دیئے۔

تھوڑی دیر بعد وہ تنویر کے ڈرائنگ روم میں اس طرح بیٹھا ہوا تھا کہ اُس کے دونوں اس کی پشت پر بندھے ہوئے تھے اور پیر بھی آزاد نہ تھے۔

تنویر کی بیوی برابر چیخے جا رہی تھی۔ ”ہائے تنویر کہاں ہیں۔ تنویر کیا ہوئے۔“
”تم اپنی انگوٹھی وہیں چھوڑ آئے تھے۔“ فریدی نے اس آدمی سے مسکرا کر کہا۔

وہ کچھ نہیں بولا۔ بدستور سر جھکائے بیٹھا رہا۔

”آخر اتنی جلدی کیا تھی۔“ فریدی اپنی جیب سے انگوٹھی نکالتا ہوا بولا۔ ”کل اس کا خاتمہ کر دینے“
”انگوٹھی۔“ مسرتور انگوٹھی کی طرف دیکھ کر چیخی۔ ”یہ انگوٹھی کس کی ہے۔“

”اس کی؟“ فریدی نے بندھے ہوئے آدمی کی طرف اشارہ کیا۔

”غلط... بکواس! یہ تنویر کی ہے۔“

”اور یہ کون ہے؟“ فریدی نے اس آدمی کی طرف اشارہ کیا۔

”میں نہیں جانتی۔“

”آپ اپنے شوہر کو نہیں جانتیں! حیرت ہے۔“ فریدی نے کہا اور بڑھ کر اس آدمی کے سر کے بال نوچ لئے۔ پھر بھنویں بھی نوچ ڈالیں۔ ہونٹوں پر سے پلاسٹک کے ٹکڑے نوچے۔
تنویر اپنی مصنوعی وحشت سمیت اُن کے سامنے تھا۔ اس کی بیوی نے چیخ ماری اور گر کر بیہوش ہو گئی۔

پاگلوں کی کہانی

اس کیس نے شہر میں سنسنی پھیلا دی تھی۔ اخباروں کے کرائم رپورٹر کو توالی اور محکمہ سراغ رسانی کی عمارتوں کے گرد چکر لگا رہے تھے۔ تنویر حوالات میں تھا اور پرویز کو بھی پچھلی رات کو ہوش آچکا تھا لیکن ڈاکٹروں کی ہدایت کے مطابق کسی نے بارہ گھنٹے تک اس سے کوئی گفتگو نہ کی۔ مقتول ایجنٹ کے متعلق چھان بین کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ تنویر کے گہرے دوستوں میں سے تھا۔ جس کار میں ان دونوں نے سفر کیا تھا وہ کار پوریشن کی ملکیت تھی۔ تنویر کی بیوی بھی اس ایجنٹ کو جانتی تھی لیکن یقینہ معاملات سے اُسے کوئی سروکار نہ تھا۔

تنویر نے بڑی مشکلوں سے اعتراف جرم کیا تھا۔ سول پولیس تو اپنے سارے حربے استعمال کر کے ہار گئی تھی۔ آخر فریدی نے وہ طریقہ استعمال کیا، جو دوسروں کی نظروں میں انتہائی احمقانہ تھا۔ حمید تو سمجھا کہ شاید فریدی کے دماغ میں بھی فتور واقع ہو گیا ہے لیکن تنویر کا بیان ہے کہ اگر وہ سلسلہ کچھ دیر اور جاری رہتا تو وہ سچ مچ پاگل ہو جاتا۔

فریدی نے اُسے ایک بڑی سی میز پر چت لٹا کر اس کے ہاتھ پیر اس طرح کس دیئے تھے کہ وہ جنبش نہ کر سکے۔ پھر اس نے اس کے سر کے دونوں طرف دو تختیاں کھڑی کر کے ان میں کیلیں ٹھکوا دیں۔ اب اس کا سر بھی جنبش نہیں کر سکتا تھا۔ آنکھیں چھت کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ پھر اُس نے ایک ہانڈی منگوائی اور اس کی پینڈی میں چھوٹا سا سوراخ کر کے اس میں ذرا سا کپڑا ٹھونس دیا۔ ہانڈی میں پانی بھرا گیا اور وہ عین تنویر کے سر پر چھت سے لٹکادی گئی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد ایک ایک بوند تنویر کی پیشانی پر ٹپکتی رہی۔ تقریباً آدھ گھنٹے تک وہ خاموش رہا پھر اس نے بوڑھانا شروع کر دیا۔ ”وہ آئی... وہ گری... آ... آ... آ... آئی... گری...“

گل.... گل.... گل.... گری۔“

پھر وہ چیخنے لگا۔ ”میں پاگل ہو جاؤں گا.... ہٹاؤ.... اس ہانڈی کو.... فریدی کینے سو رہاؤ.... وہ گری.... ارے میری پیشانی پھٹی۔ چھوڑ دو مجھے.... بتاتا ہوں.... بتاتا ہوں میں نے ہی ثمنینہ کو اس کمرے میں پہنچایا تھا۔ میں نے ہی ایجنٹ کو مارا تھا۔ وہ گری.... ارے! مرا.... میں پاگل....!“

پھر اس نے سب کچھ اگل دیا۔ وہ ثمنینہ سے پرویز کے ایک دوست کی حیثیت سے ملا تھا جو اس نے بھیس بدل رکھا تھا اس لئے وہ اُسے پہچان نہ سکی۔ تویر کو اس کے مجسمے کے متعلق ایجنٹ ہی سے معلوم ہوا تھا۔ وہ ایجنٹ تویر کو دونوں حیثیتوں سے جانتا تھا۔ تویر کی حیثیت بھی اور اُس بدلے ہوئے بھیس میں مسٹر شمشاد کی حیثیت سے بھی۔ اُسے یہ بھی معلوم تھا۔ دونوں ایک ہی ہیں۔ اس قسم کے مجسمے اور ریکارڈ کا آرڈر چونکہ ایک نئی اور حیرت انگیز بات تھی اس لئے اس نے اس کا تذکرہ تویر سے بھی کیا۔ وہ تصویر بھی دکھائی جس کے مطابق مجسمے کی تیار ہوئی تھی۔ اس سے پہلے حقیقتاً تویر کو اس بات کا علم نہیں تھا کہ پرویز بھی اسی شہر میں موجود ہے۔ اس اطلاع پر اس نے خفیہ طور پر چھان بین کی تو اُسے معلوم ہوا کہ پرویز تقریباً تین سال سے رہ رہا ہے۔ ثمنینہ اس کے ساتھ نہیں ہے۔

ثمنینہ سے جس طرح اس کی ملاقات ہوئی اس کی تفصیل بھی بڑی دلچسپ تھی۔ تویر شروع ہی سے گرمیوں کے زمانے میں جنسی دیوانگی کے دورے پڑا کرتے تھے لیکن وہ اپنی خواہشات کی تکمیل کھلم کھلا نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ اسے اپنی بیوی سے بڑی محبت تھی اور وہ خاص قسم کی جنسی دیوانگی جس کا وہ شکار تھا اپنی نوعیت کے لحاظ سے ایسی نہیں تھی کہ کسی ایک پر قناعت کرتی۔ تویر نیک نام بھی رہنا چاہتا تھا اور اپنی ضرورت بھی اس کے پیش نظر تھی لہذا اس نے گرمیوں کے زمانے میں خود کو کچ کچا پاگل بنا کر پیش کرنا شروع کر دیا۔ بھیس بدلنے کی غرض سے وہ ہمیشہ اپنے سر کے بال اور بھنویں منڈوا دیا کرتا تھا اور اپنی عجیب و غریب نیند کے بہانے تین دن تک گھر سے غائب رہتا۔ یہ ایام قرب و جوار کے شہروں یا سعید آباد ہی کی طوائفوں میں گزرا کرتے تھے یہاں آتا تو اسی ایجنٹ کے یہاں ٹھہر تا اور دونوں مل کر عیاشی کرتے۔ ایجنٹ جانتا تھا کہ وہ کس مجبوری کی بناء پر بھیس بدلا کرتا ہے۔ لیکن اسے یہ قطعی نہیں معلوم تھا کہ وہ پرویز

بھائی ہے۔

ایک رات شہر کے ایک حصے میں تویر کو ثمنینہ مل گئی۔ اس رات وہ ایجنٹ اس کے ساتھ نہیں تھا۔ تویر نے ثمنینہ کا تعاقب کر کے اس کی جائے رہائش کا پتہ لگالیا اور ایک دن اُسے راہ میں روک کر اس سے پوچھا کہ وہ ثمنینہ تو نہیں ہے۔ اس نے ثمنینہ کو بتایا کہ وہ پرویز کا ایک دوست ہے اور اس کے یہاں اس کی تصویر دیکھ چکا ہے۔ ثمنینہ نے اُسے بتایا کہ ان دونوں میں ناچاقی ہو چکی ہے اور پرویز اُس سے ناراض ہے۔ اس پر تویر نے اُسے یہ اطلاع دی کہ وہ تو اُسے پوچھتا ہے۔ محاورہ نہیں بلکہ حقیقتاً اس نے اس کا ایک مجسمہ بنوایا ہے اور وہ کچ کچ اس کی پرستش کرتا ہے۔ ثمنینہ بے قرار ہو گئی۔ کئی سال طوائفانہ زندگی بسر کرنے کے بعد وہ پھر سے گھر بسانے کے خواب دیکھنے لگی۔ اس اطلاع نے اس کا مستقبل روشن کر دیا تویر نے اس کا اندازہ پہلے ہی لگالیا تھا کہ پرویز نے وہ مجسمہ کس لئے بنوایا ہے۔ اگر چیخوں والا ریکارڈ بھی ساتھ ہی نہ بنواتا تو شاید وہ بھی یہی سمجھتا کہ اس نے وہ مجسمہ اپنی محبت کی تسکین ہی کے لئے بنوایا ہے۔

اس کمرے کے متعلق جس میں وہ مجسمہ رکھا گیا تھا ایجنٹ سے پہلے ہی معلوم ہو گیا تھا۔ کمرے کی ساخت کے بارے میں معلوم کرنے کے بعد اس نے اندازہ لگایا کہ وہ کسی کو نہ ہی پر ہوگا۔ ایک رات وہ پرویز کی کوٹھی کی پشت پر پہنچا۔ ایک روشندان سے چیخوں کی ہلکی آوازیں آ رہی تھیں اور پھر اس نے اچھی طرح اطمینان کر لیا کہ مجسمہ اسی کمرے میں ہے۔

اس دوران میں وہ ثمنینہ سے برابر ملتا رہا۔ وہ اس بات کو اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر کبھی وہ پرویز کے سامنے چلی گئی تو وہ اُسے زندہ نہ چھوڑے گا۔ لہذا اس نے پروگرام بنانا شروع کیا کہ اسے کسی طرح اُس مجسمے والے کمرے میں پہنچا کر مجسمہ غائب کر دیا جائے۔ اس طرح سانپ بھی مرے گا اور لاش بھی نہ ٹوٹے گی۔ پرویز کی پھانسی کے بعد اس کی دولت بھی اچھے چڑھے گی۔

ثمنینہ نے پرویز کا پتہ بہت پوچھا۔ مگر تویر نے نہ بتایا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر وہ روز روشن میں بھی وہ اس سے ملی کہ وہ اس پر حملہ ضرور کرے گا مگر یہ حملہ کسی کے کچ بچاؤ کر دینے پر ناکام بھی ہو سکتا ہے۔

تویر نے اس سے کہا کہ وہ پرویز کو متحیر کرنا چاہتا ہے کیوں نہ وہ اُسے اس کمرے میں پہنچا کر اس کا مجسمہ غائب کر دے۔ ثمنینہ نے اس تجویز کو پسند کیا پھر وہ دونوں ایک رات وہاں جا پہنچے۔

تویر کو اندر پہنچایا اور وہاں سے وہ مجسمہ اور ریکارڈ لے کر فوج پر ہو گیا۔ یہ بات تو اُسے ایجنڈہ معلوم ہو گئی تھی کہ پرویز نے اُس مجسمے کے معاملے میں بڑی رازداری سے کام لیا تھا حتیٰ کہ نے نوکروں کو بھی اس کی ہوا تک نہیں لگنے دی تھی۔

سر جنت حمید ایک ایک کا ہاتھ پکڑ کر کہتا پھر رہا تھا کہ فریدی اس صدی کا عظیم ترین پادشاہ ہے کہ اس نے ایک پاگل پن کی حرکت کر کے اس پاگل سے سب کچھ اگلا لیا۔ اب وہ تیسرے پاگل کی روداد سننے کے لئے بے چین تھا جس نے سونے کا ریکارڈ توڑ دیا تھا۔ حالات مصلحہ خیز پہلو اس کے ذہن میں بالکل بچائے ہوئے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ایک شوہر بیوی محروم ہو گیا اور ایک بیوی شوہر سے ہاتھ دھو بیٹھی۔ بات صرف اتنی تھی کہ دونوں نے تصوف راہ پر زور ہے دوڑ لگادی تھی۔

شام کو فریدی اور حمید ہسپتال پہنچے۔ پرویز تنکے سے ٹیک لگائے بستر پر نیم دراز تھا۔ وہ دونوں اس کے قریب جا کر بیٹھ گئے۔

”میرا خیال ہے کہ میں پہلے بھی آپ حضرات کو دیکھ چکا ہوں۔“ اس نے نغمہ آواز میں کہا۔
”حادثے والی رات کو۔“ فریدی بولا۔

دفعۃً پرویز کے چہرے پر مردنی چھا گئی اور تھوک نکل کر خشک ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا۔
”میری دانست میں آپ قطعی بے قصور ہیں۔“ فریدی نے کہا۔

”لیکن اب میں زندہ نہیں رہنا چاہتا۔“ پرویز مضطرب آواز میں بولا۔

”کیا آپ کو معلوم ہو گیا؟“

”جی ہاں اخبار... ایک مریض کی عنایت سے اخبار مجھے مل گیا تھا۔“

”بہر حال تویر حراست میں ہے۔“

”اس نے جو کچھ بھی کیا اچھا ہی کیا۔ میں نہیں چاہتا کہ اسے کوئی گزند پہنچے۔ ثمنینہ جب میرے سامنے آتی میں اس کے ساتھ یہی برتاؤ کرتا۔“

”شروع میں تو آپ دونوں کے بہت اچھے تعلقات تھے۔“ فریدی نے کہا۔

”تعلقات... میں اُسے سچ پوچھتا تھا۔ لیکن میں اس کے متعلق ہمیشہ دھوکے میں ہی رہا۔“

میں اُسے پاک باز سمجھتا رہا۔ لیکن یہ حقیقت بعد کو واضح ہوئی کہ شادی سے پہلے ہی اس نے

تعلقات بہتروں سے رہ چکے تھے۔ وہ حقیقتاً ایسی نہیں تھی کہ کسی ایک ہی کی ہو رہتی۔ اسی کی بدولت میرے اور تویر کے درمیان بٹوارہ ہوا تھا۔ وہ ایسی جگہ رہنا ہی نہیں چاہتی تھی جہاں کوئی نہ کوئی ہر وقت اس کے سر پر مسلط رہے۔ رقیہ بڑی نیک عورت ہے اسی لئے ثمنینہ نے اس کے ساتھ رہنا گوارا نہ کیا؟“

”رقیہ کون؟“ فریدی نے پوچھا۔

”تویر کی بیوی۔ ابھی ابھی یہاں سے اٹھ کر گئی ہے۔ کسی طرح تویر کو بچائے ورنہ وہ بے موت مر جائے گا۔“

”محال ہے۔“ فریدی بولا۔ ”اس کی گردن پر دودو خون ہیں۔“

پرویز خاموش رہا لیکن اُس کے چہرے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ شدید ترین قلبی اذیت میں مبتلا ہے۔

”کیا آپ کو معلوم تھا کہ ثمنینہ بھی اسی شہر میں موجود ہے۔“ فریدی نے پوچھا۔

”نہیں! وہ اب سے چار سال پہلے میرے ایک دوست کے ساتھ فرار ہو گئی تھی اور اس کے بعد سے پھر مجھے اس کے متعلق کچھ نہیں معلوم ہوا۔ بہر حال انتقام کی آگ نے مجھے قریب قریب پاگل کر دیا تھا۔“

”لیکن آپ نے اسے مار کس طرح ڈالا۔“ فریدی نے پوچھا۔ ”کیا آپ کو اس کا احساس نہیں ہوا تھا کہ آپ ایک ذی روح کا گلا گھونٹ رہے ہیں۔“

”اسے سوچنے سمجھنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ جیسے ہی میں اندر داخل ہوا وہ کچھ کہے سے بغیر مجھ سے لپٹ گئی۔ اس وقت میں نے نقب کی طرف خیال نہیں کیا تھا۔ دفعۃً

میرے دونوں ہاتھ اس کی گردن پر جا پڑے اور غیر شعوری طور پر میری گرفت سخت ہو گئی۔ نوکروں نے مجھے بتایا تھا کہ انہوں نے چیخیں سنی تھیں لیکن مجھے اس کا بھی ہوش نہیں۔ میری

سمجھ میں نہ آیا کہ کیا ہو گیا۔ دوبارہ جب میں ٹارچ منگوا کر اندر گیا تو وہ مجسمہ بھی موجود نہیں تھا۔ نقب کی طرف میں نے اُس وقت بھی دھیان نہیں دیا تھا۔ اس کے متعلق تو مجھے آج ہی اخبار کے ذریعہ معلوم ہوا۔

فریدی اور حمید کچھ دیر رسی گفتگو کرتے رہے پھر اٹھ آئے۔

”آج آر لکچو میں بڑا زور دار پروگرام ہے۔“ حمید نے راستے میں کہا۔

”ابھی تمہارا دل پروگراموں سے نہیں بھرا۔“ فریدی بولا۔

”پتہ نہیں آپ آدمی ہیں یا بلونگ پیپر۔“

فریدی کچھ نہیں بولا۔

”ایک بات آج تک سمجھ میں نہ آئی۔“ حمید نے تھوڑی دیر بعد کہا۔ ”کوئی شوہر اپنی بیوی بد چلتی نہیں برداشت کر سکتا۔ لیکن عموماً بیویاں اپنے شوہروں کی بد چلتی برداشت کرتی رہتی ہیں۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟“

”لیکن تمہاری بیوی تمہیں کبھی نہ برداشت کر سکے گی۔“ فریدی بولا۔

”تو کیا میں بد چلن ہوں۔“ حمید بگڑ کر بولا۔

”نہیں تم تو فرشتے ہو۔“

”معاف کیجئے گا۔ جناب میں لڑکیوں سے صرف دوستی کرتا ہوں۔“

”ہر پڑھا لکھا بد چلن یہی کرتا ہے۔“ فریدی نے کہا۔

”کیا کہا۔“ حمید چیخ کر بولا۔ ”بد چلن کہہ لیجئے لیکن اگر پڑھا لکھا کہا تو اچھا نہ ہو گا۔“

فریدی ہنسنے لگا۔

”اگر ہم اس وقت آر لکچو ہی میں کھانا کھائیں تو کیا خرچ ہے۔“ حمید نے کہا۔

وہ دونوں آر لکچو میں آئے۔ ڈائننگ ہال میں ابھی تھوڑی بہت گنجائش تھی۔ حمید نے ایک ایسی میز پر قبضہ جمالیا جس کے گرد و پیش کئی خوبصورت لڑکیاں تھیں۔

”افوہ یار! تم بھی کہاں آ رہے۔“ فریدی آہستہ سے بڑبڑایا۔

”کیا ان لڑکیوں سے وحشت ہو رہی ہے وہ کیسی رہے گی۔“ حمید نے ایک لڑکی کی طرف آنکھوں سے اشارہ کیا۔

”خدا نے چاہا تو ہمیشہ بخیریت رہے گی۔۔۔ ادھر ادھر مت دیکھو۔۔۔ اے بوائے مینولا۔“

فریدی نے مینولا دیکھ کر کچھ چیزوں کا آرڈر دیا اور پھر کئی کنکھتے ہوئے قہقہے اس کے کانوں میں گونجنے لگے۔ قریب کی میز پر بیٹھی چار لڑکیاں حمید کی طرف دیکھ کر ہنس رہی تھیں۔

فریدی نے حمید کی طرف دیکھا جو سر جھکائے نہایت سنجیدگی سے طرح طرح کے منہ بنارہا تھا۔

”میا بیہودگی ہے۔“ فریدی نے اُسے آہستہ سے جھڑکا۔

”نہ جانے کیا ہو گیا ہے ہونٹوں میں۔“ حمید نے سر اٹھا کر سنجیدگی سے کہا۔ ”کھلی۔۔۔ کیسی کھلی۔“

اس نے فریدی کو بھی منہ چڑھا دیا۔

”میں جاتا ہوں۔۔۔ گدھے سورا پبلک مقامات پر بیہودگی کھل جاتی ہے۔“

”اب بتائیے کھلی کو کیا کروں۔“

”جو تے سے کھلاؤں گا۔“ فریدی بگڑ کر بولا۔

بہر حال حمید نے وہ رات فریدی پر حرام کر دی۔

اور اس کیس کے سلسلے میں بعد کے واقعات میں صرف یہی بات بہت زیادہ اہم ہے کہ

عدالت نے پرویز کو قتل کی نیت نہ رکھنے کی بناء پر بری کر دیا۔ فاضل جج نے تجویز میں لکھا تھا کہ

قتل ارادنا نہیں بلکہ اضطراری کیفیت کے تحت سرزد ہوا تھا۔ جس کی وجہ خوفزدگی بھی قرار دی

جاسکتی ہے۔ عدالت کی نظروں میں صحیح معنوں میں مجرم تنویر ہی تھا۔ ثمنینہ کے معاملے میں اسے

دس سال قید بامشقت کی سزا دی گئی اور ایجنٹ کے قتل کے سلسلہ میں سزائے موت۔

مسز تنویر کی حالت بہت ابتر تھی۔ فیصلہ سنتے ہی وہ عدالت میں بیہوش ہو گئی۔ زندہ تو وہ اب

بھی ہے لیکن ہڈیوں کا ڈھانچہ ہو کر رہ گئی ہے۔ پرویز ہر طرح اس کا خیال رکھتا ہے، لیکن اس کے

ذہن میں اتر جانا اس کے بس کی بات نہیں۔

ختم شد